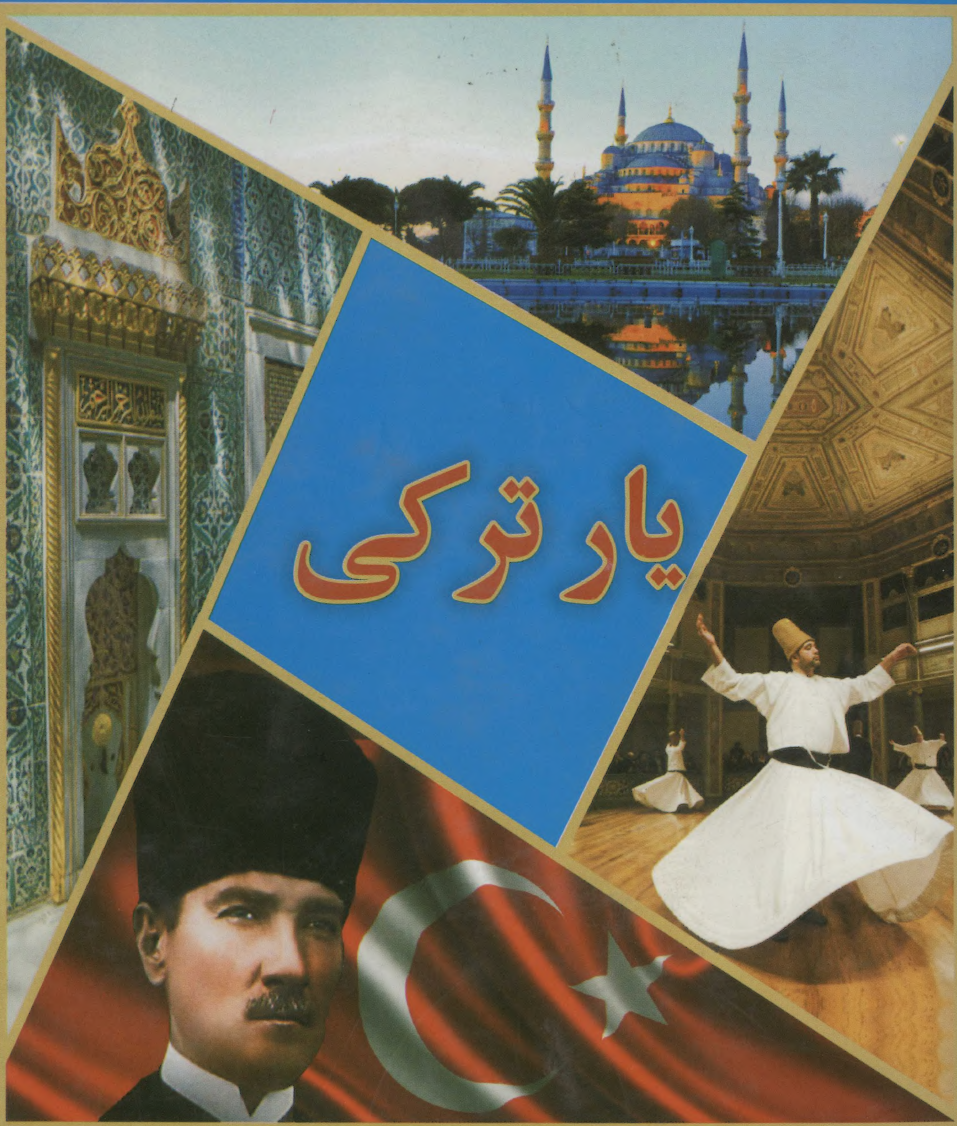
فیروز شاه گیلانی



یار ترکی

فیروز شاہ گیلانی

جُمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books



• نام کتاب۔ یار ترکی • مصنف۔ فیروز شاہ گیلانی
• اشاعت۔ 2014ء • سرورق۔ مصباح سرفراز
• ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور

ISBN:978-969-9739-93-4

قیمت 350 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

Yar Turkey

Jumhoori Publications

2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan
T: +92-42-36314140 F: +92-42-36283098
info@jumhooripublications.com
www.jumhooripublications.com

انتساب

ترک اور پاکستانی عوام کے
درمیان بے مثال دوستی کے نام

فہرست

اپنی بات

سفرنامہ ایک طرف تو راقم کی اپنی یاداشتیں اور سفر کے دوران تجربات کو محفوظ رکھنے کی کوشش ہوتی ہے تو دوسری طرف سفر کے دوران تجربات، محسوسات اور مشاہدات کو قارئین تک پہنچانے کی ایک کوشش بھی۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ من گھڑت قصے کہانیاں سفرنامہ کا حصہ نہ بن جائیں، لیکن یہ ضروری ہوتا ہے کہ جس ملک کا سفرنامہ لکھا جائے وہاں کے جغرافیائی، تاریخی اور سماجی عوامل کسی حد تک ضرور اجاگر کیے جائیں۔

ہم پاکستانیوں کے نکتہ نظر سے ترکی کوئی عام سا ملک نہیں ہے۔ برصغیر اور بالخصوص پاکستان سے ترکوں کے جو دینی، سماجی اور ثقافتی رشتے ہیں وہ کئی صدیوں تک پھیلے ہوئے انتہائی گہرائی کے حامل ہیں، مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ اب تک ترکی پر خاطر خواہ تعداد میں سفرنامے نہیں لکھے جا سکے۔

مجھے ترکی میں تین دفعہ جانے کا اتفاق ہوا، اگرچہ میں وہاں پورے ملک میں تو سفر نہ کر سکا، لیکن ترکی کے جن علاقوں میں مجھے جانے کا موقع ملا سیاحت کے نکتہ نظر سے وہ بے حد اہم علاقے ہیں۔ ان علاقوں میں قدم قدم پر اہم تاریخی واقعات کی یادگاروں کے ساتھ انتہائی اہم روحانی مقامات بھی قابل دید ہیں۔ سب سے بڑھ کر پرخلوص اور بہادر ترکوں سے ملاقات اور ان سے تبادلہ خیالات کے مواقع ایک عظیم سرمایے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ترکوں اور پاکستانیوں کے درمیان تعلقات سب سے جدا اپنی مثال آپ ہیں، چنانچہ اس سفرنامے میں میری کوشش رہی ہے کہ ان تعلقات کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جا سکے۔ اسی نسبت سے اس سفرنامے کا نام ''یار ترکی'' ہے۔

فیروز شاہ گیلانی

یارترکی

ویلکم کاردیش یعنی خوش آمدید برادر

یہ چونکا دینے والے دلفریب الفاظ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اس جواں سال ترک آفیسر کے تھے جو استنبول کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر پاسپورٹ کنٹرول ڈیوٹی پر متعین تھا۔ یہ اس نے میرا سبز رنگ والا پاکستانی پاسپورٹ دیکھ کر کہا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی اللہ کا شکر ادا کیا کہ کم از کم اس ملک ترکی میں تو ہماری اور ہمارے پاسپورٹ کی عزت کی جاتی ہے۔ میری اہلیہ ڈاکٹر نسیم اور میرے لیے یہ ایک غیر متوقع تجربہ تھا۔ اس لیے کہ استنبول پہنچنے سے پہلے ہم یورپ کے کئی ممالک بشمول انگلینڈ، فرانس، بیلجیئم، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی سیاحت کرتے ہوئے ترکی پہنچے تھے۔ یورپ کے ان ممالک میں کسی نے ہمارے سبز پاسپورٹ دیکھ کر ہمیں اس طرح خوش آمدید نہیں کہا تھا، بلکہ بعض جگہوں پر تو ہمارے پاکستانی پاسپورٹ دیکھ کر ان کے چہروں کے روکھے پن میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔

استنبول ائیرپورٹ پر دوسرے مرحلے میں کسٹم افسروں کا ہم سے برتاؤ اسی طرح دوستانہ تھا۔ یہ بھی سبز پاسپورٹ کی کرامت تھی۔ ورنہ وہاں کسٹم خاصا سخت تھا اور تمام مسافروں کا سامان کھلوا کر چیک کیا جا رہا تھا۔ ترکی ائیر لائن کے ملازمین اور ائیر ہوسٹس کو بھی کوئی رعایت نہیں مل رہی تھی، مگر ہمارے سامان کی کوئی چیکنگ نہ کی گئی۔ صرف اسی ملک میں ہمارے پاسپورٹ کھل جا سم سم والی تاثیر رکھتے تھے۔

ائیرپورٹ پر ہمیں لینے کے لیے ترکی، ایران اور پاکستان کی مشترکہ تنظیم آر۔سی۔ڈی تنظیم کے سابق پاکستانی نمائندے، پاکستان نیوی کے ریٹائرڈ افسر کیپٹن حسن اور ان کی بیگم ایوا آئے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں اپنے فلیٹ پر لے آئے، جہاں ہم کچھ دیر کے لیے ستائے اور ان کے ساتھ مل کر ہم نے

استنبول کے اہم مقامات دیکھنے کا پروگرام بنایا۔

جس بلڈنگ میں حسن صاحب کا فلیٹ تھا وہاں ترک بحریہ کے دو تین سینئر افسر اور ایک ایڈمرل بھی رہتے تھے۔ صبح کا وقت تھا ہم نے دیکھا کہ بلڈنگ کے مرکزی دروازے کے سامنے ایک بڑی سی کار آ کر رکی، جس میں پہلے سے ایک سینئر ترک آفیسر بیٹھے تھے۔ بلڈنگ دو فلیٹوں سے دو اعلیٰ عہدے کے نیول آفیسر نکل کر آئے اور اس رکی ہوئی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ میرے پوچھنے پر حسن صاحب نے بتایا کہ ترکی میں افواج کے اور سویلین افسر سادگی سے رہتے ہیں اور انھیں علیحدہ علیحدہ سرکاری کاریں نہیں ملتیں۔ ترک فوج کا سربراہ بھی جب ملازمت سے ریٹائر ہوتا ہے تو اسے کوئی خاص مراعات نہیں ملتیں۔ وہ بھی تین چار کمروں کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ نہ اسے کوئی بنگلہ ملتا ہے اور نہ ہی زرعی زمینیں۔

ترکی کی سیاسی قیادت بھی سادگی سے رہتی ہے۔ وہاں کے مشہور لیڈر بلند ایجوت تین مرتبہ وزیراعظم رہ چکے ہیں۔ وہ وزارات عظمیٰ کے دوران بھی وزیراعظم کی شاہانہ رہائش گاہ میں نہیں رہتے تھے، بلکہ وہ تمام عرصہ اپنے ذاتی تین بیڈ روم والے فلیٹ میں ہی رہتے رہے اور اپنی بیس سال پرانی چھوٹی سی کار بھی خود ہی چلاتے تھے۔ کاش پاکستانی لیڈر اور افسران بھی ترکی سے سبق سیکھیں اور قرضوں میں ڈوبے ہوئے ملک کے وسائل کا ضیاع نہ کریں۔

تھوڑی دیر بعد ہم نزدیک میں واقع ایک چھوٹے سے ہوٹل میں منتقل ہو گئے جہاں ہمارے لیے ایک کمرہ حسن صاحب نے پہلے سے ریزو کرا رکھا تھا۔ ہوٹل کے مالک ایک عمر رسیدہ آرمینائی شخص تھے۔ انھوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنی اہلیہ سے ملوایا۔ انھوں نے ہمارے آرام کے لیے تسلی بخش انتظام کیا ہوا تھا۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ ترکی کے آرمینائی عیسائی ترکوں پر الزام لگاتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ترکی نے ان پر بے انتہا ظلم ڈھایا تھا اور ہزاروں لوگوں کا قتل عام کیا تھا۔ جب کہ ترک ان الزامات کو نہیں مانتے تھے۔ بہرحال یہ عمر رسیدہ آرمینائی جوڑا ہمیں ترکوں کے رویے سے مطمئن نظر آیا اور ہمارے ساتھ ان کا برتاؤ بہت اعلیٰ تھا۔

ترکی، یورپ اور ایشیا کا پل

ترکی کو جغرافیائی طور پر مغرب اور مشرق کے درمیان ایک پل کی حیثیت حاصل ہے۔ موجودہ ترکی کا رقبہ 7,79,452 کلومیٹر ہے، جس میں سے 23,764 کلومیٹر یورپ میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں اس کی سرحدیں ایران سے ملتی ہیں اور مغرب میں یونان اور مرمرہ سمندر اور جہاں درہ دردانیال کا سمندر بحرہ اسود اور بحر اوقیانوس (بحرہ روم) کو آپس میں ملاتا ہے۔ ترکی کے شمال میں بحیرہ اسود، جارجیا اور بلغاریہ ہیں، جب کہ جنوب میں شام، عراق، قبرص اور بحرہ اوقیانوس ہے۔

سترھویں صدی عیسوی میں جب ترکوں کی سلطنت عثمانیہ اپنے پورے عروج پر تھی تو اس وقت اس کی سرحدیں مغرب میں رومانیہ، ہنگری اور یوگوسلاویہ تک پھیلی ہوئی تھیں دوسری طرف اس وقت شام، عراق، موجودہ اسرائیل، مصر، شمال افریقہ بشمول الجزائر ترکی میں شامل تھے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی سے سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہوا اور آہستہ آہستہ عظیم ترک مملکت سکڑ کر موجودہ حالت میں باقی رہ گئی۔

موجودہ ترکی کے دفاع اور اس کو قائم رکھنے میں ترکی کے عظیم رہنما مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک اور ان کے ساتھیوں کا بے مثال تاریخی رول ہے۔ اس لیے مصطفیٰ کمال پاشا کو اتاترک کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بیسویں صدی کی ابتدا میں اس وقت کی سپر پاور برطانیہ، فرانس اور ان کے اتحادی ممالک بشمول یونان کو فیصلہ کن شکست دے کر اپنے ملک کا دفاع کیا۔ 1915ء میں انگریز جنرل ہملٹن جو ترکی میں گیلی پولی (Galipoli) کے محاذ پر برطانیہ کی قیادت میں اتحادی افواج کی قیادت کر رہا تھا نے بڑے بول کے طور پر کہا تھا کہ برطانیہ کا ایک فوجی شجاعت اور مہارت میں کئی درجن ترکوں پر بھاری تھا۔

جنرل ہملٹن کا سارا غرور خاک میں مل گیا جب ترکوں نے بے جگری سے لڑتے ہوئے انگریزی فوج اور اس کے اتحادیوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ امریکہ میں چھپنے والی مشہور کتاب ملٹری بدقسمتیں (Military Misfortunes) لکھنے والے دانش ور ایلیٹ کوہن اور جارج کوچ لکھتے ہیں کہ اس محاذ پر ترکوں نے اپنی بہادری سے یہ ثابت کر دیا کہ ایک ترک سپاہی دس برطانوی سپاہیوں کے برابر تھا۔

گیلی پولی کا معرکہ ترکوں کا عظیم کارنامہ تھا، جب کہ برطانیہ کی سربراہی میں اتحادی ممالک کے لیے یہ ایک ڈراؤنا خواب بن گیا۔ یہاں ''اتحادیوں کے تقریباً 2,50,000 فوجی کام آئے اور تین لاکھ ترکوں نے وطن کی حفاظت اور جہاد کے لیے اپنی جانیں نچھاور کیں۔ اتحادیوں کی عبرتناک شکست سے چرچل اور جنرل کچنر دونوں کی شخصیت داغدار ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی ترکوں کی تاریخ بہادری اور شجاعت کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر بہادر شخص ایک بہترین دوست بھی ہوسکتا ہے۔ ترکوں کی پاکستان اور پاکستان کے لوگوں سے دوستی کی بنیاد قدیم اور جدید زمانوں پر محیط واقعات پر رکھی گئی ہے۔

1219ء میں چنگیز خان نے جنگ وجدل اور عظیم فتوحات کے سلسلے کو صحرائے گوبی کی وسعتوں سے نکال کر متمدن سرزمینوں تک پھیلا دیا اور منگولوں نے اپنے غیض وغضب کا نشانہ سب سے پہلے ترکوں کو بنایا۔ اس وقت ترک خراسان، ترکستان، خوارزم اور ایران تک پھیلے ہوئے تھے۔

ایک ترک قبیلے ارطغرل کے بیٹے عثمان نے سلجوقی سلطان اور دیگر امرا سے مل کر ایک مضبوط ریاست قائم کی، پھر یہ عثمانی ترک ایشیائے کوچک کے علاقوں میں 1300ء سے سلجوقیوں کے جانشین بن گئے۔ حقیقی معنوں میں اس وقت سے عظیم الشان سلطنت عثمانیہ کی بنیاد پڑی۔

عثمانی ترکوں کی فتوحات یورپ اور ایشیا اور افریقہ میں دور دور تک پھیل گئیں۔



خلافتِ عثمانیہ

منگولوں کے حملوں اور وسیع علاقوں میں اقتدار کے بعد ترکوں کے متعدد قبیلے سارے علاقوں میں پھیل گئے اور انھوں نے جہادی مہموں کا آغاز کر دیا۔ انھی میں سے ایک قبیلہ عثمانیوں کا بھی تھا۔ ابتدا میں یہ سلجوق سلطانوں اور تبریز میں منگول اِل خان کے زیر اثر تھے۔ غزہ (جہاد) کرنے والے سردار غازی کہلاتے تھے اور بازنطینی علاقوں میں کارروائیاں کرتے تھے۔

ان جہادی قبیلوں میں سے ایک قبیلے کے سردار علی نے ناطہ توڑ کر وسیع علاقوں پر قبضہ کر لیا، مگر اس نے بازنطینیوں سے صلح کر لی۔

عثمان غازی کا علاقہ علی کے علاقے کے جنوب میں تھا۔ جب علی نے جہادی لشکر کشی ختم کی تو عثمان نے جہادی لشکروں کی قیادت سنبھال لی اور بازنطینی علاقوں میں بھرپور طریقے سے جہاد شروع کر دیا۔ اردگرد کے غازی بھی عثمان غازی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونا شروع ہو گئے۔

1301ء (700ہجری) میں عثمان بڑھ کر بازنطینی (عیسائی) دارالحکومت ازنک (Iznik) کے قریب پہنچ گیا۔ اسے خانہ بدوش ترکمانوں کی مدد بھی حاصل ہو گئی۔

قدیم ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ عثمان کو غازی بننے کے لیے اس کے مرشد شیخ ایدے بالی نے ہدایت کی تھی۔ آہستہ آہستہ عثمان دیگر غازیوں کا رہنما بن کر ابھرا۔ یہ سب پورے علاقے کو منگولوں کے ظلم وستم سے بھی نجات دلانا چاہتے تھے۔

ازنک کو بچانے کے لیے بازنطینی بادشاہ نے عثمان کے خلاف ایک مضبوط فوج روانہ کی، مگر عثمان نے گھات لگا کر حملے میں اس فوج کو تباہ کر دیا، پھر وہ (یعنی عثمان) بڑھ کر برصہ پہنچ گیا۔ یہ وہ وقت

تھا جب سلجوق سلطان نے عثمان کی سیاسی حیثیت کو مان کر اسے ایک ''بے'' کا رتبہ عطا کیا۔ اس کے ساتھ ہی عثمان کی شہرت تمام مسلمان ممالک میں پھیل گئی۔

عثمان کی قوت سے ڈر کر عیسائی بازنطینی بادشاہ نے منگول شہزادوں غازن خان اور اوجیتو خان سے معاہدے کرنے کی کوشش کی، مگر عثمان نے بالاخر 1301ء میں ازنک اور برصہ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح عثمان کی شہرت اور دبدبہ دور دور تک پھیل گیا۔

غازی عثمان اور اس کے ساتھیوں کے متعلق تاریخ نویس عروج اس طرح لکھتا ہے۔

''یہ بہادر غازی سچائی کی خاطر اللہ کے راستے پر چل کر غازہ (جہاد) کا ثمر حاصل کر کے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ سچائی کی تلاش کرتے ہیں اور دین کی عظمت کیلیے جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ دنیا میں تکبر نہیں کرتے اور شریعت کے راستے پر چلتے ہیں۔ یہ کفار سے بدلہ لیتے ہیں۔ یہ سائلوں اور مسافروں کے دوست ہیں اور مشرق و مغرب میں اسلام کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔''

عثمانی یہ سمجھتے تھے کہ مغرب کی طرف ان کی متواتر فتوحات اور پھیلاؤ اللہ کی مرضی اور مدد سے ممکن ہو رہا تھا اور تو اور بازنطینی عیسائی بشمول لوتھر (Luther) بھی اس خیال کو درست سمجھتے تھے۔

نئی عثمانی سلطنت کے وزیر اورخان بے نے 1331ء میں عیسائیوں کے مرکزی شہر ازنک میں قلعے کے اندر عیسائی درسگاہ کو اسلامی مدرسہ بنا دیا اور ساتھ ہی غریبوں کے لیے متعدد رہائش گاہیں، کارواں سرائے اور حمام تعمیر کرائے جن کی عمارات ابھی تک موجود ہیں۔ اسی طرح اسلامی اوقاف کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

عثمان کے ساتھ ساتھ اس کا بہادر اور قابل بیٹا اُرخان غازی بھی سلطنت کو وسیع کرنے میں پوری طرح شامل ہو گیا۔ جب بازنطینی شہنشاہ اندرونیکس (Andronicus) نے ازنک کو عثمانیوں سے آزاد کرانے کی کوشش کی تو عثمان کے بیٹے نے اسے شکست فاش دے دی۔ عثمان کے بعد اس کا بیٹا ارخان غازی سلطنت عثمانیہ کا سربراہ بنا۔

اس کے بعد ارخان غازی کا بیٹا مراد اول تخت نشین ہوا۔ اس زمانے میں اردگرد کے عیسائی فرمانروا بھی اس کے باجگزار ہو گئے۔ یہاں تک کہ اینڈرونکس چہارم (Andronicus IV) عثمانیوں کی مدد سے بازنطینی تخت حاصل کر سکا۔ بدلے میں عثمانیوں کو 1379ء میں گیلی پولی جیسا مضبوط قلعہ اور اردگرد کا علاقہ مل گیا، پھر 1353ء عیسوی میں عثمانیوں نے انقرہ کو فتح کر لیا۔ جو اس وقت ایک اہم معاشی اور سیاسی

مرکز تھا۔اس سے عثمانیوں کومنگولوں اور سلجوقوں کے علاقوں میں پیش قدمی کا موقع مل گیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ترکوں نے یورپ میں فتوحات حاصل کر کے بلقان کے بڑے حصے پر اپنا اقتدار قائم کر دیا۔

جب مراد اناطولیہ میں تھا تو انھی دنوں بلقان میں سربیا(SERBIA) کے لوگوں نے بغاوت کر دی جنھیں بوسنیا والوں کی مدد بھی حاصل ہوگئی، پھر بلغاریہ والے بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ترک فوج نے ان بغاوتوں پر کافی حد تک قابو پالیا۔مراد نے خود بھی کوسوو(KOSOVO)اور سربیا(SERBIA) کے میدانوں میں فوج کشی کی اور جون 1389ء میں ترکوں کی فتح مکمل ہوگئی۔

مراد خود میدان جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔ وہ زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔اس کے بعد اس کا بیٹا بایزید یلدرم تخت نشین ہوا۔ یلدرم کا مطلب طوفان ہوتا ہے۔خانہ جنگی سے بچنے کے لیے بایزید کے بھائی کو قتل کر دیا گیا۔

بایزید نے پوری عیسائی دنیا کو چیلنج کر دیا۔جس پر مصر میں موجود اسلامی خلیفہ نے اسے ''سلطان روم'' کا لقب عطا کر دیا، جس سے یہ حقیقی طور پر سلجوق سلطنت کا وارث بن گیا،لیکن تھوڑے عرصے بعد امیر تیمور (تیمور لنگ) نے بایزید کو انقرہ کے مقام پر عبرت ناک شکست دیکر اناطولیہ میں اس کا اقتدار ختم کر دیا۔

بعد میں عثمانیوں نے سلطان محمد دوئم کے زمانے میں دوبارہ مشرق اور مغرب میں اپنے اقتدار کو توسیع دی تا کہ بایزید کے زمانے کی سلطنت کو دوبارہ قائم کیا جا سکے،جس مقصد میں وہ بلقان سے واپس پہنچ کر کامیاب ہو گئے۔

بلقان (یورپ) اور اناطولیہ میں عثمانی سلطنت کی مضبوطی کی وجہ مسلمان حکمرانوں کا غیر مسلم رعایا سے بہترین حسن سلوک تھا۔عثمانی جن علاقوں کو فتح کرتے تھے،وہاں پہلے سے موجودہ استحصالی فیوڈل نظام کو ختم کر دیا جاتا تھا اور غریب کاشتکاروں سے بیگار بھی ختم کر دی جاتی تھی۔مثلاً بوسنیا کے عیسائی حکمران نے ایک دفعہ پوپ کو شکایت کرتے ہوئے 1463ء میں لکھا کہ زرعی مزارعین اور کاشتکار عثمانیوں کے طرف دار ہو گئے ہیں اس لیے کہ مسلمان ان سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں اور انھیں آزادی کی نوید دیتے ہیں۔فتح کرنے کے بعد عثمانی فاتح زرعی زمینوں پر کام کرنے والے غیر مسلم کاشتکاروں کو ان زمینوں کا منتظم بنا دیتے تھے اور پرانے فیوڈل اپنی حیثیت کھو بیٹھتے تھے۔اس طرح عثمانیوں کو نچلے طبقے کے

عیسائیوں کی حمایت حاصل ہو جاتی تھی، جس سے ان کو مزید فتوحات میں مدد ملتی تھی۔

اسی طرح قسطنطنیہ کی فتح سے پہلے بھی عثمانی ترک عیسائی چرچ کے ایک طرح سے محافظ سمجھے جاتے تھے۔ تاریخی طور پر عام عیسائی مقامی یونانی کٹر (آرتھوڈکسن) چرچ کے حامی تھے۔ اسے بازنطینی چرچ کہتے تھے اس کے مقابلے میں وہ لاطینی کیتھولک کے رومی نظام کو پسند نہیں کرتے تھے، جب کہ عیسائیوں کے امرا اور فیوڈل اس کے حامی تھے۔

عثمانی ترکوں نے بازنطینی چرچ کے پادریوں کو اور مراعات کے علاوہ زرخیز زرعی اراضی بھی عطا کر رکھی تھیں۔

عثمانیوں نے ان علاقوں پر قبضہ کیا جہاں مسلمانوں کی حکومتیں تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ اسلام میں کسی دوسرے مسلمان پر تلوار اٹھانا ناجائز تھا اس لیے وہ دھمکیوں سے اور دوسرے پر امن طریقوں سے ان پر قبضہ کرنے کوشش کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ انھوں نے عثمانیوں کے جہاد میں عیسائیوں سے ساز باز کی تھی اور عثمانیوں کی جہاد مہموں میں انھیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

امیر تیمور نے بھی غازیوں کے سلطان یعنی عثمانی سلطان کے خلاف حملہ کافی دن روکے رکھا، لیکن جب اس نے 1402ء میں عثمانی سلطنت کو شکست دی تو اس نے خود کو غازی ثابت کرنے کے لیے صلیبی جنگ جوؤں پر حملہ کر دیا اور ازمیر کا شہر ان سے چھین لیا۔ بعد میں 1420ء میں سلطان محمد اول نے امیر تیمور کے بیٹے شاہ رخ کو لکھے خط میں اپنے آپ کو غازی ظاہر کیا تا کہ وہ اس پر حملے نہ کرے۔

1514ء میں عثمانی سلطان سلیم اول نے عثمانی سلطنت کو مشرق اور جنوب کی سمت وسعت دی۔ ایران کے صفوی شاہ اسماعیل اول کو ترکوں نے جنگ چالدران میں شکست دے کر مملکت کو شام، فلسطین اور مصر تک وسیع کر دیا۔

جب عثمانی ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ مصر تک جا پہنچا تو 1514ء میں سلطان سلیم اول خود مصر جا پہنچا۔ اس نے قاہرہ میں قدیم مقابر اور آثار کی زیارت کرنے کے علاوہ خانہ کعبہ جانے والے کاروان میں بھی شرکت کی۔ اس موقع پر سلطان سلیم کو شریف مکہ ابوالبرکات نے فتح مصر کی مبارک دی اور خانہ کعبہ کی چابی بھیجی۔

دوسری دفعہ جب سلطان سلیم 924 ہجری میں مصر گیا تو واپسی پر آخری عباسی خلیفہ متوکل علی اللہ ثالث کو مصر سے اپنے ساتھ قسطنطنیہ لے آیا۔ خلیفہ متوکل نے جامعہ آیا صوفیا میں ایک پروقار تقریب

میں خلافت اور اس کے تبرکات یعنی سیف، علم اور ردا نبوی ﷺ سلطان سلیم اول کے حوالے کئے گئے۔ ا طرح مسلمانوں کی خلافت بھی آل عثمان کے ہاتھ آ گئی، چنانچہ اس طرح ملت اسلامیہ کی تاریخ میں خلافت عثمانیہ کے پرشکوہ طویل دور کی ابتدا ہوئی جو سلطان سلیمان عظیم کے دور میں ہر طرح سے عروج پر پہنچی۔

سلطنت عثمانیہ کا سب سے زیادہ عروج سلطان سلیمان عالی شان کے دور حکومت میں ہوا سلطان سلیمان، سلطان سلیم اول کا اکلوتا بیٹا تھا جو 6 نومبر 1494ء کے دن پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش بح اسود کے ساحلی شہر ترابزن میں ہوئی۔

سلیمان 1520ء میں 26 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

سلطان سلیمان کو قانونی کا لقب بھی حاصل تھا یعنی اپنے لوگوں کے لیے قانون بنانے وال جب کہ اہل یورپ اسے سلیمان عالی شان کے نام سے پکارتے تھے۔

سلطان سلیمان کے زمانے میں ترک سلطنت کی وسعت سب سے زیادہ ہوئی۔ اس 1521ء میں بلغراد کو فتح کیا اور 1522ء میں اہم جزیرے رہوڈس (Rhodes) کو سلطنت عثمانیہ میں شا کیا۔

اس نے ہنگری کے بادشاہ لیوس (Lewis) کو 1526ء میں شکست فاش دی، جس میں وہ ما گیا۔ سلطان سلیمان نے بوڈا کو 1529ء میں فتح کر لیا۔

1529ء کے دو مہینوں ستمبر اور اکتوبر میں سلطان سلیمان نے اس زمانے کی مضبوط سلطن آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کا محاصرہ کئے رکھا، مگر وہ اسے فتح نہ کر سکا۔

سلطان سلیمان کی سلطنت کی حدود مصر اور ایران تک پھیل گئی اور اس کا بحری بیڑا یورپ احمر بشمول یمن اور عدن کا مالک بن گیا۔ اس کا تقریباً پورے بحر اوقیانوس پر قبضہ تھا۔ اس کے امیر البح باربروسہ سے شمالی افریقہ، اٹلی اور اردگرد کے لوگ بری طرح خائف رہتے تھے۔ 6 ستمبر 1566ء کے د ترک فوجوں نے وزیر اعظم کے زیر کمان ہنگری کو فتح کر لیا۔

سلطان سلیمان نے فوج اور عدالتی نظام میں دوررس اصلاحات کیں وہ ایک شاعر بھی تھا ا زیورات بنانے کا ہنر بھی جانتا تھا۔ اس نے سلطنت عثمانیہ پر 46 سال حکومت کی۔

سلطان سلیمان کے زمانے میں استنبول میں بہت سے ترقیاتی اور فلاحی کام ہوئے۔ ان میں

سلیمانیہ مسجد، خود سلطان سلیمان کی وفات پر اس کی قبر ماہر تعمیرات سنان کی بنائی ہوئی مسجد سلیمانیہ کے قرب میں ایک عمارت میں بنائی گئی۔ اس زمانے میں اس کی بیوی حورم سلطان کے نام پر بھی مسجد، بیٹے جہانگیر کے نام پر مسجد، پبلک حمام وغیرہ بنائے گئے۔ انھی دنوں میں سلطان کی بیوی نے ''عورتوں کی سلطنت'' جیسے نظام کی بھی ابتدا کی۔

1534-35ء میں سلطان سلیمان نے ایران کے ساتھ تین بڑی جنگیں لڑیں۔ اس دور میں اس نے ارض روم کا علاقہ ایران سے چھین لیا۔ اس طرح اس نے عراق کو بھی فتح کر لیا۔

اس کے بعد 1548-49ء میں وان جھیل کے اردگرد کا خاصا بڑا علاقہ بھی سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔

اس کے بعد 1554-55ء میں سلطان سلیمان نے ایران پر تیسرا بڑا حملہ کیا، لیکن اس دفعہ نتیجہ مختلف نکلا اور ایران کی صفوی سلطنت نے سلطان سلیمان کی پیش رفتی روک دی۔ اس کے بعد 1555ء میں ان دونوں ممالک کے درمیان ایک باقاعدہ معاہدے پر دستخط ہوئے، مگر اس سے بھی عثمانیہ سلطنت کو مشرق کے اس ہمسایے سے کوئی فوائد حاصل نہ ہوئے۔

امیر البحر خیر الدین بر بروسہ کی سربراہی میں سلطنت عثمانیہ ایک ناقابل شکست قوم بن کر ابھری تھی۔ عثمانی بحری بیڑے نے 1538ء میں یونان کے خلاف فتح حاصل کی۔ 1551ء میں شمالی افریقہ عثمانیوں کے زیر اثر آ گیا۔ اسپین نے ایک مضبوط بحری بیڑے کے ساتھ ترکوں پر حملہ کیا، لیکن ترکی بحری بیڑے نے 1560ء میں اسے تباہ کر دیا۔

اگرچہ 1565ء میں مالٹا کی لڑائی میں ترک فتح حاصل کرنے میں ناکام رہے، لیکن ترکی کی بحریہ کا رعب و دبدبہ ہندوستان تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں ترکوں نے مصر سے 1538ء میں ایک جنگی بیڑا پرتگیزیوں کے خلاف بھیج کر دیو (Diu) کا شہر فتح کر لیا۔

1559-61ء کے دوران سلطان سلیمان کے بیٹوں سلیم اور بایزید کے درمیان تخت حاصل کرنے کے لیے خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں سلیم کو فتح ہوئی اور بایزید کو قتل کر دیا گیا۔

سلطان سلیمان خود ہنگری کے شہر زیگوار کے محاصرے کے دوران وفات پا گیا، جہاں سے اس کی میت استنبول میں لائی گئی۔

سلطان سلیمان اپنے اردگرد انتہائی قابل لوگوں کو رکھتا تھا۔ اس کے تین وزرائے اعظم، رستم

پاشااور محمد سلولی پاشا اسلامی قوانین کے ماہر تھے۔اس زمانے کا مشہور شاعر باقی ماہر تعمیرات سنان بھی اس کے درباری تھے۔اسی طرح خوجہ چلیبی اور کمال پاشازادہ بھی اس کے اصلاح کار تھے۔سلطان سلیمان نے فتح کردہ قلعوں کو زیادہ مضبوط بنوایا اور بطور خاص استنبول کو ایک عظیم عثمانی سلطنت کے شایان شان شہر بنادیا۔اس زمانے میں بحیرہ روم (Mediterenian) کی وسعتوں پر امیر البحر خیر الدین پاشا اور عظیم ماہر تعمیرات سنان پاشا کی قیادت میں سلطنت عثمانی کا مکمل غلبہ تھا۔

سلطان نے امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین خادم الحرمین الشریف کا لقب اختیار کیا۔اس وقت سے بطور خاص ترک اسلام کے پرجوش داعی اور غازی بنے۔ان کے حرمین الشریف کے انتظامات اور اخراجات مثالی تھے۔سلطان کا مقرر کردہ ایک ایک نمائندہ شیخ الاسلام کی حیثیت سے بطور خاص مکہ مکرمہ اور حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا منتظم اعلیٰ ہوا کرتا تھا جو سلطان کی نمائندگی کرتے ہوئے ہر روز فجر کی نماز کی ادائی کے بعد اپنے خادمانہ لباس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کی جالیوں کے اندر مقصودہ شریف میں صلوۃ وسلام پیش کرتا تھا۔ان تمام کاموں کو وہ اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا تھا۔

ترک حکمرانوں نے اسلام اور اس کے شعائر کا پوری طرح احترام کیا۔ترک بالعموم مجاہد اور سرفروش ہونے کے ساتھ ساتھ دینی عقائد اور عبادات کے بھی پابند تھے اور وہ پورے جزیرہ نما عرب کے محافظ تھے۔ایک شاعر نے ترکی کی عظمت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

نور سے توحید کے وہ طالعِ بیدار تھی　　آسمانِ دہر میں وہ مطلعِ انوار تھی
امتِ بیضا بھی واثق تھی اُنہی کے عہد میں　　سلطنت عثمانیوں کی قافلہ سالار تھی

سلطان عثمانیہ کے بانی عثمان کو اسلام کے دینی بزرگوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔اس لیے اسے عثمان غازی کہا جاتا تھا یہ اوغز ترکوں کے قبیلے کائی سے تعلق رکھتا تھا وہ ایک چھوٹے قبیلے کا سردار تھا، مگر شجاعت اور بہادری میں وہ سب سے بڑھ کر تھا۔اسے ایک روحانی بزرگ شیخ ایدے بالی کی حمایت حاصل تھی، جنھوں نے اسے غازی بننے کے لیے کہا تھا جس سے اس کے عزائم کو تقویت ملی۔

اس زمانے میں عیسائیوں کی بازنطینی مملکت کمزوری اور مذہبی منافرت کا شکار تھی، چنانچہ عثمان غازی مرکزی کے شہر اشکے شہر سے لے کر بروصہ (برصہ) تک کے علاقے کا مضبوط حکمران بن گیا تھا۔اس کے بعد سلجوق سلطان نے بھی عثمان کو ''عثمان بے'' کا رتبہ دے کر اسے ایک اہم سیاسی قوت کے طور پر تسلیم کرلیا۔

1301ء میں عثمان بے کی شہرت تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی تھی اور بڑی تعداد میں ترک قبیلوں نے اس کے زیر اثر علاقوں کی طرف ہجرت کی۔ اس زمانے کے تاریخ نویس عروج نے تواریخ العسمان میں لکھا'' یہ (عثمانی) غازی دین اسلام اور سچائی کے لیے حقیقی جدوجہد کر رہے ہیں، مگر یہ مغرور اور خودسر نہیں ہیں۔ یہ شریعت کے مطابق کفار سے بدلہ لیتے ہیں۔ یہ اجنبی مسافروں کے دوست ہیں اور اسلام کے پیغام کو مشرق و مغرب میں پھیلا رہے ہیں۔''

1514ء میں عثمانی سلطان سلیم اول نے عثمانی سلطنت کو مشرقی اور جنوبی سمت میں وسعت دی۔

پھر 1453ء میں سلطان محمد فاتح کی قیادت میں ترکوں نے عیسائی سلطنت کے عظیم شہر قسطنطنیہ (Constantinople) کو فتح کر کے نبی کریم ﷺ کی اس خوشخبری کی تکمیل کی کہ'' ایک دن آئے گا کہ مسلمان قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔''

ترک مملکت کی دینی اور روحانی اہمیت میں اضافے نے اسے دیگر تمام مسلمانوں کے لیے بے حد باعزت اور قابل تقلید بنا دیا۔ برصغیر ہند کے حاکم مسلمان بشمول مغل بادشاہوں کے سب اپنے آپ کو ترک خلافت کے مطیع سمجھتے تھے اور اہم معاملات میں ترک خلفا سے ہدایت اور مشوروں کے طلب گار رہتے تھے۔

انیسویں صدی عیسوی کے آخر سے ترک مملکت کو'' مرد بیمار (Sick Man of Europe)'' کہا جاتا تھا، مگر برصغیر کے مسلمان ترکوں کے سب سے بڑے بہی خواہ تھے۔ تحریک خلافت کے دوران برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی غربت اور تنگدستی کے باوجود رقوم اکٹھی کر کے ترکوں کی مدد کے لیے بھیجی تھیں۔ یہاں تک کہ مسلمان خواتین نے اپنے زیور تک اتار کر ترک بھائیوں کی مدد کے لیے بھیجے۔ ترکوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے جذبوں کی تہہ دل سے قدر کی۔

ترک پاکستان کو برصغیر کے تمام مسلمانوں کا نمائندہ ملک سمجھتے ہیں اس لیے وہ پاکستانیوں کی پرخلوص عزت کرتے ہیں۔ بلقان کی جنگ کے زمانے میں برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں نے دل کھول کر ترک بھائیوں کے لیے چندہ جمع کیا۔ یہ چندہ مولانا ظفر علی خان لے کر خود استنبول گئے تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے اس ایثار کو بے حد سراہا گیا۔ خود ترکی کے خلیفۃ المسلمین نے مولانا ظفر علی خان کو شرف باریابی بخشا تھا۔ خلیفہ صاحب نے لاہور کی بادشاہی مسجد کے لیے ایک قالین بطور تحفہ عطا کیا۔

ترکی سے واپسی پر دہلی میں مولانا ظفر علی خان کا ایک بڑا جلوس نکالا گیا اور مولانا کی گاڑی خود لوگوں نے کھینچی ہجوم کا یہ عالم تھا کہ دو آدمی بھی کچلے گئے۔

ترکوں کی حمایت میں برصغیر میں خلافت اور ترک موالات کی پر جوش تحریکوں کے آغاز ہی میں مولانا ظفر علی خان گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں پانچ سال قید با مشقت کی سزا ہوئی جو انھوں نے بڑی پامردی سے جھیلی۔ اس وقت انھیں جیل میں سب سے نچلی کلاس میں رکھا گیا۔ انھیں ڈھور ڈنگروں کی طرح چوروں، ڈاکوؤں کے ساتھ کال کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا تھا۔

ترکوں کی حمایت میں انھی دنوں میں مولانا محمد علی جوہر پورے اسلامی ہند کے لیڈر تھے ان کی آواز اس وقت کے دس کروڑ مسلمانوں کی آواز بن گئی۔

مولانا محمد علی 1920ء میں خلافت کا وفد لے کر انگلستان گئے۔ خود ترکوں کے ہاتھوں خلافت کی تنسیخ کے بعد وہ ہزار کوششوں کے باوجود سنبھل نہ سکے۔ جس بنیاد پر یہ تحریک اٹھائی گئی تھی، پہلی جنگ عظیم میں ترکیہ کی شکست کے بعد جب یہ انقلاب رونما ہوا تو اس انقلاب کا اولین شکار وہ لوگ ہوئے تھے جنھوں نے ترکی کو جنگ کی آگ میں جھونکا تھا یعنی انور پاشا، جمال پاشا اور طلعت پاشا جنھیں یکے بعد دیگرے قتل کر دیا گیا تھا۔

ادھر جب ہندوستان میں تحریک خلافت کی عمارت دھڑام سے نیچے آ گری اور اس کے نتیجے میں جو ذہنی خلفشار پیدا ہوا تو اس تحریک کے کرتا دھرتا علی برادران اس انقلاب کا شکار ہوئے۔

جب تحریک کو زوال ہوا تو لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ گویا ریت کی دیوار بنانے میں لگے رہے تھے۔

تحریک خلافت نے ناکام ہونے کے باوجود بھی کچھ مثبت نتائج چھوڑے جو حسب ذیل ہیں۔

1- سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد پہلی دفعہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک رشتے میں منسلک کر کے انھیں مربوط اور منتظم کیا۔ باقی تمام مسلمان ممالک اس وقت غلامی میں جکڑے ہوئے تھے۔

2-اس تحریک نے مسلمانوں کے دلوں سے بطور خاص برطانوی حکومت کا دبدبہ محو کر دیا اور سول نافرمانی کر کے جیلوں میں جانا ایک قومی اعزاز قرار دیا گیا۔

3- مغرب زدہ مسلمانوں نے اس تحریک کے زیر اثر غیر ملکی سوٹ اتار کر نذر آتش کر دیئے اور

کھدر کے کپڑے پہن لیے۔

4- جو لوگ شروع سے اسلام دشمنی اور خدا سے گریز کا مسلک رکھنے پر فخر کرتے تھے، انھوں نے اسلام کی طرف رخ کیا اور صوم وصلوٰۃ کی شدت سے پابندی شروع کر دی۔

5- اس تحریک نے دیو بند اور علی گڑھ کے فارغ التحصیل لوگوں کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا اور ان درس گاہوں کی باہمی رقابت ختم ہو گئی۔

6- اس تحریک کے زیر اثر بڑے بڑے متمول لوگوں نے اپنے رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ چھوڑ کر برضا ورغبت فقر وفاقہ کی زندگی اختیار کر لی تھی۔

7- تحریک خلافت نے مسلمان قوم کے صرف ظاہر ہی کو نہ بدلا تھا، بلکہ لوگوں کے باطن کو بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ یہ انقلاب محض سیاسی نہیں تھا، بلکہ روحانی بھی تھا جس کی روح نے ہماری روحوں کو منور کیا تھا۔

اس لیڈر شپ میں کچھ خامیاں بھی ہوں گی لیکن قوم کے پیش نظر چونکہ صرف قربانی، بے نفسی اور ایثار تھا، کسی قسم کا دنیاوی فائدہ نہیں تھا اس لیے ان خامیوں سے قوم کو کوئی اخلاقی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

بین الاقوامی سطح پر بھی ہر جگہ اور ہر موقع پر پاکستان نے ترکوں کا ساتھ دیا۔ بطور خاص قبرص کے معاملے میں ترکوں اور یونان کے درمیان تنازع میں پاکستان نے اقوام متحدہ اور دیگر جگہوں پر ترکوں کے موقف کی بھرپور تائید کی تھی۔

ایک موقع پر 1960ء کی دہائی میں ترکی کے مرکزی بنک کی نئی عالی شان عمارت کے افتتاح پر ترک صدر نے پاکستانی صدر کی موجودگی میں اپنی تقریر میں اپنی قوم کو یاد دلایا کہ جن رقوم سے یہ بنک بنا تھا ان میں پاکستان کے مسلمانوں کے بزرگوں نے بھی مالی مدد دی تھی۔ انھوں نے اپنی قوم کو تاکید کی کہ وہ اس مدد اور ایثار کو کبھی نہ بھولیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی میں پاکستانیوں سے دوستی اور اخوت کا جو بے مثال برتاؤ کیا جاتا ہے دنیا میں اور کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔

ترک اور عرب

ترک سلطان عبدالحمید نے 1328ء ہجری میں عبداللہ بن محمد کے انتقال پر ایک خاص تقریب میں ہاشمی خاندان کے ایک اہم فرد حسین بن علی کو شریف مکہ نامزد کیا تھا۔صوبہ حجاز اس کے تحت کر دیا گیا۔

اسی دوران عرب علاقوں میں شامی عرب نوجوان تحریک وطنیہ کے تحت ترکوں سے علیحدگی اور عرب آزادی کے ذریعے دلکش مستقبل کی نوید دینے میں سرگرم تھے۔عرب علاقوں میں فضا بتدریج ترکوں کے خلاف ہو رہی تھی۔اس کے پس پشت مغربی اقوام بالخصوص برطانیہ کی ریشہ دوانیاں تھیں جو سلطنت عثمانیہ کو پارہ پارہ کر دینا چاہتی تھیں۔

9 مئی 1916ء کو برطانیہ اور فرانس نے روس کے ساتھ ایک خفیہ اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر کے اس کا شیرازہ بکھیر دیا جائے اور یہ کہ حسین بن علی شریف مکہ کی قیادت میں تمام عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔اس سلسلے میں برطانیہ کا ٹی ایچ لارنس (Lawrance of Arabia) کا رول بہت اہم تھا۔

شریف مکہ حسین بن علی کی طرف سے مکہ، طائف، جدہ، ینبع الوجہ اور حجاز کے تمام علاقوں میں بغاوت کا باقاعدہ اعلان 10 جون 1916ء کو کر دیا گیا۔

شریف مکہ کی طرف سے حجاز مقدس میں اعلان بغاوت ترکوں کے لیے حیران کن تھا، مگر انھوں نے پیش رفت کرتے ہوئے حجاز ریلوے کے ذریعے دمشق سے مدینہ منورہ میں فوج، اسلحہ، خوراک اور دیگر اشیائے ضرورت کی ترسیل پر خاص توجہ دی اور اپنی دفاعی پوزیشن کو مستحکم کیا۔

مکہ مکرمہ میں عرب بغاوت کا اعلان کر کے عربوں نے ترکوں پر گولہ باری شروع کر دی عثمانی

فوج حرم کے احترام میں خون خرابے سے اجتناب کرتی رہی اور قلعہ اجیا میں محصور ہوکر رہ گئی۔

اسی طرح مصر میں بھی برطانوی ملٹری بیورو شریف مکہ کی برپائی ہوئی بغاوتوں کو ہر قسم کی امداد مہیا کرر ہا تھا۔ عربوں کو انگریزوں نے ہر قسم کی مالی اور فوجی امداد مہیا کی۔ چنانچہ تین ماہ کے محاصرے کے بعد ترکوں نے طائف کو چھوڑ دیا۔ اس تقریب میں بہادر ترک جنرل غالب پاشا نے عبداللہ بن حسین کو مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''یہ کتنی بدنصیبی ہے کہ ہم بھائی بھائی تھے اور پھر دشمن ہو گئے۔''

عربوں نے لارنس کے ساتھ مل کر حجاز ریلوے لائن کو گوریلا کارروائیوں کے ذریعے اڑا دیا تاکہ ترک فوجی سامان اور خوراک کی مدینہ منورہ اور دیگر علاقوں میں نہ پہنچ سکے۔ ان دہشت گرد کارروائیوں میں لارنس نے عربی لباس پہن کر اہم رول ادا کیا۔ عربوں نے لارنس کے ساتھ مل کر تقریباً 35,000 ترکوں کا قتل عام کیا۔ ترکوں کی چوتھی آرمی مدینہ اور دمشق کے درمیان غیر متحرک ہوکر رہ گئی تھی جب کہ عربوں اور لارنس کو برطانیہ کے جنرل ایلن بی کے سٹاف سے ہر قسم کی مدد حاصل ہوتی رہی۔

اسرائیل کے قیام کی ابتدا

عقبہ کو ترکوں سے حاصل کرنے کے بعد برطانوی وزیر جنگ لائیڈ جارج نے 1917ء میں جنرل ایلن بی (General Allenby) کو فلسطین پر قبضہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ اس طرح مسلمانوں کا قبلہ اول جنرل ایلن بی کے یوروشلم پر قبضے کے ذریعے سات سو سال بعد مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

عربوں کی مسلمان ترکوں کے خلاف بغاوت کی وجہ سے 2 نومبر 1917ء کے دن بالفور ڈیکلریشن کی صورت میں مسلم امہ پر بجلی بن کر گرا۔ اس پروگرام میں یہودیوں کے لیے فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کی بات کی گئی تھی۔ اسے برطانوی حکومت نے 24 جولائی 1922ء کے دن لیگ آف نیشنز (Leaue of Nations) سے بھی منظور کرالیا۔ اس طرح عربوں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری۔ یہ وہی لیگ آف نیشنز تھی، جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔

من ازیں بیش نہ دانم کہ کفن دز دے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختند

اس سے پہلے یہودیوں نے بہت کوشش کی تھی کہ ترک خلیفہ کثیر دولت کے عوض ان کے لیے فلسطین میں ایک چھوٹا سا علاقہ انھیں عطا کردے، لیکن خلیفہ نے یہ تجویز سختی سے مسترد کردی اور یہودیوں کی کوئی چال کامیاب نہ ہونے دی تھی۔

پہلی جنگ عظیم کے شروع میں ترکوں نے درہ دانیال (Dardanelles) اور گیلی پولی کے معرکہ میں حملہ آور برطانوی اور ان کی اتحادی قوموں کے خلاف ترک سرزمین کا شاندار دفاع کیا تھا۔ شکست کھانے کے بعد اتحادی فوجیں وہاں سے جلدی میں چلی گئیں۔

عربوں کی ترک سلطنت کے خلاف بغاوت اور دیگر عوامل کی وجہ سے ترکوں کو روس کے محاذ سے بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔ دوسری طرف انھیں بغداد، شام، لبنان، فلسطین اور موصل وغیرہ سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔

اتحادی طاقتوں نے اگست 1918ء میں پیرس میں معاہدہ کیا کہ آرمینیا، مشرقی اناطولیہ استنبول اور درہ دردانیال روس کو دے دیا جائے۔ دوسری طرف حیفہ اور بغداد انگریزوں کے حوالے کرنا تھا۔ اسکندریہ اور موصل کو فرانس کے حوالے کرنا تھا۔ مغربی اناطولیہ، اٹلی کے حصے میں اور فلسطین اتحادیوں کے مشترکہ کنٹرول میں دے دیا گیا۔

لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد روس میں بالشوک انقلاب کی وجہ سے روس مغربی اتحادیوں کے معاہدے سے الگ ہو گیا۔ اس کو دیا گیا علاقہ اب اتحادیوں کی مشترکہ ملکیت ٹھہرا، چنانچہ 8 مارچ 1919ء کے دن اتحادیوں نے استنبول پر پوری طرح قبضہ کر لیا، اس طرح وہاں ترکی کی مجلس اقتدار بھی ختم ہو گئی۔ 66 ممتاز ترک رہنماؤں کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا گیا۔

ترکی کی آزادی کے خاتمے کے لیے داماد فرید پاشا کی صدارت میں ایک نام نہاد ترک حکومت قائم کر دی گئی۔ یہ سب مغربی طاقتوں کے درمیان معاہدہ سیور (Sevres) کے تحت ہوا۔

لارنس جس کا نام ٹامس ایڈورڈ لارنس تھا۔ برطانوی فوج کے ایک نوجوان آفیسر کی حیثیت سے عرب بدوؤں کے ایک مختصر دستے کی کمان کرتے ہوئے مدینہ منورہ کے قریب عربوں کی اس علاقے میں مقیم افواج سے ملنے کے لیے دشوار گزار پہاڑی راستے سے سفر کر کے پہنچا۔ یہ سلطنت عثمانیہ کے خلاف عربوں کی بغاوت کے ابتدائی زمانے کی بات ہے۔ برطانیہ اسے عربوں کی آزادی کا نام دے رہا تھا، جب کہ اس کا اصل ہدف ترکوں کے خلاف اپنی مہم جوئی کے لیے فوجی اور سیاسی حمایت کا حصول تھا۔

ٹی ای لارنس دنیا بھر میں لارنس آف عریبیا کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے ادبیات سیاسی و سفارتی حکمت عملی اور برطانوی فوجی مہمات میں اہم کردار ادا کیا۔ اپنے وقت کے سب سے بڑے انگریز سر ونسٹن چرچل نے اسے ''ہمارے عہد کی ایک عظیم ترین زندہ شخصیت'' قرار دیا تھا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب Seven Pillers of Wisdom میں لکھا کہ وہ حقیقت میں عربوں کی آزادی کی خاطر ترکوں کے خلاف لڑا تھا۔

ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت میں وہ حسین مکہ کے بیٹے فیصل سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے اس کے ساتھ مل کر کئی گوریلا کارروائیاں کیں اور ترکوں کی رسل و رسائل کی اہم چیز حجاز ریلوے کو کئی جگہوں سے تخریبی کارروائیوں سے اڑا دیا۔

انگریز اوپر سے تو عربوں کی آزادی کے لیے کام کررہے تھے، لیکن در پردہ وہ ترکوں کے عرب سے نکل جانے کے بعد اسے مغربی طاقتوں میں حصے بخرے کر کے ہضم کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے، چنانچہ اس سلسلے میں برطانیہ اور فرانس کے درمیان سائیکس پیکاٹ اگریمنٹ ہوا۔ لارنس کو اس سے دکھ پہنچا۔ چنانچہ 1919ء میں لندن کے بکنگھم پیلس کی ایک شاہی تقریب میں اس نے شاہ جارج پنجم سے فوجی اعزاز قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح برطانیہ کو احساس دلایا جائے کہ اس نے اپنے عرب دوستوں کے ساتھ کس قدر مکروہ اور گھٹیا سلوک روا رکھا تھا۔ انگلستان کے عام لوگ اپنے جنگی ہیرو کے اس غیر متوقع کردار کو دیکھ کے حیران ہو کر رہ گئے تھے۔

ترکی کے خلاف مغربی سامراجی قوتوں اور عرب مسلمانوں کی سازشوں اور غداری کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ 1744ء بمطابق 1157 ہجری نجد میں ایک چھوٹے سے قبیلے کے سربراہ محمد بن سعود اور محمد بن عبدالوہاب جو حنبلی فرقے کے عالم تھے کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا۔ معاہدے کی رو سے یہ طے پایا کہ تمام مسلمانوں کو ان کے فرقے کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ اس طرح ایک وہابیہ فرقہ پیدا ہو گیا۔ جب 1792ء میں محمد بن عبدالوہاب کا انتقال ہوا اس وقت تک اس فرقے کا حلقہ اثر وسطی عرب میں پھیل چکا تھا۔ اس وقت عثمانی سلطنت کے حصے حجاز اور ملحقہ علاقوں میں سعودی جنگ جوؤں کے حملوں کا خطرہ بڑھ گیا۔

وہابی تنظیم نے کئی سطحوں پر سلطنت عثمانیہ کو چیلنج کیا۔ چنانچہ 1802ء میں وہابیوں نے کربلا پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور بڑے پیمانے پر شہر میں لوٹ مار ہوئی۔ اس طرح عراق کے صوبے میں بھی وہ حملے کرتے رہے۔ انھوں نے 1803ء اور 1805ء میں مکہ مکرم اور مدینہ منورہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے اگلے سال امیر سعود بن عبدالعزیز نے حجاز سے زیارت کرنے والے عثمانی قافلوں کو روک دیا۔

اس کے علاوہ وہابی مسلمانوں نے عثمانیوں کی مذہبی حیثیت اور ان کے علما کی حیثیت کو ماننے سے انکار کر دیا اور صوفی طریقوں کی سخت مخالفت شروع کر دی۔ اس طرح وہابیت نے مسلمانوں کے اندر نا اتفاقی پیدا کر دی۔ انھوں نے اس زمانے میں مسلمانوں کے اتحاد کو نقصان پہنچایا، جب کہ اس کی سخت ضرورت تھی۔ اس لیے کہ 1798ء میں فرانس نے مصر پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو غلام بنا دیا تھا۔

اس زمانے میں عرب علاقوں میں ترکوں کے خلاف انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا، لیکن نادان عرب قائدین نے فروعی اختلافات کو ہوا دے کر مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچایا جس کا فائدہ مسلم امہ کے دشمنوں نے اٹھایا۔

غازی مصطفیٰ کمال پاشا کا رول

ترکی کے مخدوش حالات میں بہادر ترکوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں دو لاکھ فوج تیار کی تاکہ اتحادی اور دیگر دشمنوں سے ترکی کی سرزمین کو چھڑایا جائے۔

29 اگست 1922ء کو حملہ کر کے ترک فوج نے بروصہ، ازمیر پر قبضہ کرلیا۔ ترکوں کی کامیابی دیکھتے ہوئے مغربی اتحادی ممالک نے عصمت پاشا کے ساتھ معاہدہ کر کے استنبول، تھریس، اناطولیہ اور ایشیائے کوچک ترکوں کے حوالے کر دیا۔

31 اکتوبر 1923ء کو ترکی کی وطنی تحریک نے مصطفیٰ کمال پاشا کو صدر منتخب کر کے ایک دستوری حکومت قائم کرلی۔ اس وقت انقرہ کو ترک ریاست کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔

معزولی کے بعد سلطان وحید الدین اپنے خاندان کے ساتھ مالٹا چلے گئے۔ اس پرنیشنل اسمبلی نے عبدالحمید ثانی کو نیا خلیفہ بنا دیا، مگر مصطفیٰ کمال پاشا نے سلطنت کو خلافت سے علیحدہ کر کے خلیفہ کو بے اثر کر دیا۔

20 نومبر 1922ء کی لوزان کانفرنس میں عصمت انونو کی قیادت میں سلطنت عثمانیہ کی نمائندگی کی گئی، مگر یہ کانفرنس ناکام رہی۔

برطانیہ نے ایک دفعہ پھر دولت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے قومیت اور وطنیت کی بنیاد پر اپنے عزائم کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح اندرونی اور بیرونی سازشوں کی وجہ سے عظیم خلافت عثمانیہ پارہ پارہ ہوگئی۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے وزیر انور پاشا کی وجہ سے ترک فوج کا مرکزی منصب حاصل کیا تھا۔

اب یورپی انداز معاشرت پر ترک نیشنلزم کی بنیاد پڑی۔ رسم الخط بھی رومن کر دیا گیا۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنے لیے ''اتاترک'' (ترکوں کا باپ) کا لقب اختیار کیا۔ انھوں نے صدر بننے کے اگلے سال خلیفہ عبدالمجید ثانی کو معزول کر دیا۔ خلافت کا منصب بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا اور معزول خلیفہ فرانس چلے گئے۔

24 جولائی 1924ء کے دن برطانوی سیکرٹری خارجہ لارڈ کرزن نے پارلیمنٹ میں فخریہ انداز میں کہا ''ہم نے ترکی کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اس کی روحانی طاقت اور اسلام کو ختم کر دیا ہے۔ اب یہ ملک اپنی سابقہ شناخت و عظمت کو کبھی بھی بحال نہیں کر سکتا۔''

لیکن اگر دیکھا جائے تو ایک عام ترک آج بھی اسی جذبے سے سرشار ہے جو اس کے اجداد کا ورثہ اور سرمایہ افتخار ہے جو چار سو سال تک خادم الحرمین الشریفین رہے تھے۔ اسی جذبہ محبت، احترام و عقیدت کے ساتھ ترک آج بھی جوق در جوق حرمین الشریفین میں حاضر ہوتے ہیں۔ وہاں جانے والوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ترکی کی سلطنت عثمانیہ کو انیسویں صدی عیسوی سے ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا، لیکن بیسویں صدی کے اوائل سے ان مصیبتوں میں اضافہ ہو گیا۔

مغرب کی یورپی طاقتوں نے ترک مملکت کے خلاف گہری سازشیں شروع کر دیں۔ چنانچہ 1911ء میں اٹلی نے شمالی افریقہ میں لیبیا پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضے میں کر لیا۔ اسی طرح رہوڈس اور ایشیا مائنر کے دیگر جزیرے بھی ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گئے۔

انھی دنوں میں بلقان کی چھوٹی عیسائی ریاستوں نے ایک اتحاد بنا کر ترکوں پر حملے شروع کر دیئے۔ ان کا مقصد ترکوں کو پورے بلقان سے نکال دینا تھا۔ انھوں نے اسے مذہبی جنگ کا رنگ دے کر مسلمانوں پر بے انتہا ظلم ستم توڑے۔ انھوں نے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو بھی معاف نہ کیا، چنانچہ مصطفیٰ کمال پاشا کی والدہ اور بہن کو بھی مہاجر بن کر استنبول میں پناہ لینا پڑی۔

انھی دنوں میں ادرنہ بھی ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گیا، مگر 1912ء میں انور پاشا نے ترکوں کے جانبازوں دستوں کی مدد سے ادرنہ کو دوبارہ فتح کر لیا۔

1908ء کے نوجوان ترکوں کے انقلاب (Young Turk Revolution) کے پانچ سالوں بعد مصطفیٰ کمال پاشا کو صوفیا (بلغاریہ) کی طرف جلاوطن کر دیا گیا، جہاں انھوں نے ایک عیسائی بلغاری

لڑکی سے شادی کرنے کی کوشش کی، لیکن اس وقت مسلمانوں اور ترکوں کے خلاف عیسائیوں کی مخالفت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ لڑکی کے باپ نے اپنی بیٹی کی شادی ایک ترک سے کرنے کی شدید مخالفت کی۔ اس طرح یہ شادی بھی نہ ہوسکی۔

1919ء میں مصطفیٰ کمال پاشا سمسن (Samsun) آ گئے۔ انھی دنوں میں وہ استنبول کی مرکزی حکومت اور بالخصوص سلطان محمود ششم کی پالیسیوں سے بے حد بدظن ہو گئے اس طرح انھوں نے اپنے ہم خیال ترکوں کی مدد سے ترکی کی متبادل آزاد حکومت قائم کرلی۔ ان کا مقصد ترکی سے انگریزوں یونانیوں اور ان کے اتحادیوں کو نکال دینا تھا، لیکن ترکی خلیفہ ان کے خلاف غیر ملکی غاصبوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

ترک سلطان اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے بطور خلیفہ یہ فتویٰ جاری کر دیا کہ مصطفیٰ کمال کی ذات قابل گردن زدنی تھی اور یہ کہ جو کوئی انھیں قتل کرے گا وہ سیدھا جنت میں جائیگا۔

جب برطانیہ کے زیر اثر مرکزی حکومت کا دباؤ زیادہ بڑھ گیا تو کمال اتاترک نے فوج سے استعفیٰ دینے کا ارادہ کرلیا تاکہ وہ عوام میں شامل ہوکر جنگ آزادی کو عوام کی مدد سے جاری رکھ سکیں۔ ان کے کچھ ساتھیوں نے انھیں فوج سے استعفیٰ دینے سے روکنے کی کوشش کی کہ شاید فوجی وردی کے بغیر ان کا اثر شاید کم ہوجائے گا، لیکن انھوں نے یہ مشورہ نہ مانا اور مستعفی ہو گئے۔

استنبول کی مرکزی حکومت نے کاظم کارابا قر کو مصطفیٰ کمال پاشا کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا مگر انھوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کو گرفتار کرنے کے بجائے ان سے تعاون کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے مصطفیٰ کمال کے شریک کار بن گئے۔

اب مصطفیٰ کمال پاشا نے سارے ملک سے نمائندگان کی کانگریس کا اجلاس سیواس (Sivas) میں بلالیا۔ کانگریس نے مصطفیٰ کمال پاشا کو عاملہ کمیٹی کا سربراہ چن لیا جس کا مقصد اناطولیہ کے حقوق کا دفاع تھا۔ اس موقع پر متفقہ فیصلے کے ذریعے انگورا (انقرہ) کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔

استنبول میں پارلیمان نے 17 فروری 1920ء کے دن مصطفیٰ کمال پاشا کے قومی پروگرام کی اجازت دے دی۔

یونانیوں اور ان کے اتحادیوں کے خلاف اب مصطفیٰ کمال کے تحت فوج بڑی بے جگری سے

لڑی۔ وہ ہر اہم محاذ پر اپنی فوج کے ساتھ بنفس نفیس موجود ہوتے تھے، جس سے فوج کا حوصلہ مزید بڑھ جاتا تھا۔

اس جنگ میں خالدہ ادیب خانم بھی جنگ میں ترکوں کا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ انھیں ترکی کی ہیرو جون آف آرک (Joan of Arc) کہا جانے لگا۔ وہ فتح کے بعد سمرنا (ازمیر) میں مصطفیٰ کمال پاشا کے ساتھ داخل ہوئیں۔ بعد میں خالدہ ادیب خانم ہندوستان بھی آئیں اور انھوں اور زعما کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؒ سے بھی ملاقات کی تھی۔ واپس ترکی جا کر انھوں نے سفر نامہ ہند بھی لکھا تھا۔

مصطفیٰ کمال پاشا کو آرمینیا کے عیسائیوں کی شورش سے بھی واسطہ پڑا جنھیں انھوں نے بالاخر ترکی کے علاقوں سے نکال دیا۔ بعد میں آرمینیا روس کا حصہ بن گیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی کوششوں سے فرانس کے خلاف شدید قسم کی گوریلا جنگ شروع ہوگئی تھی۔ اس طرح اٹلی کو بھی مفتوحہ علاقوں سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ دونوں ملکوں نے وہاں سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

استنبول سے مرکزی حکومت کی بھیجی ہوئی فوج بھی تتر بتر ہوگئی اور کافی لوگ مصطفیٰ کمال پاشا کے ساتھ مل گئے۔ اب صرف ترکوں کا روایتی دشمن یونان باقی رہ گیا تھا۔

ایک بڑے محاذ پر 26اگست 1922ء کے دن مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنی فوج کے ساتھ پو پھٹنے سے پہلے صبح کے وقت یونانی فوج پر حملہ کر دیا۔ یونانی کی بڑی فوج کا نصف حصہ اس حملے میں موت کا شکار یا زخمی ہوا یا گرفتار ہوا۔ باقی یونانی فوج نے مزید جنگ لڑنے سے انکار کر دیا۔ ترکی میں 9 ستمبر 1922ء کے بعد سے اس دن کو قومی یادگار دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس معرکہ میں اتاترک کی قیادت میں ترک فوج نے نو دن تک مسلسل بغیر کسی آرام اور وقفے کے شدید جنگ کی اور نو دن تک جانباز گھوڑوں پر سوار رہے۔ یہ سب ترکوں کا ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا مقصد اعلیٰ تھا۔

غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے خلاف یہ زہریلا پروپیگنڈا کیا جاتا رہا ہے کہ وہ دہریہ تھے اور اسلامی شعار کے مخالف تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ رجعت پسند ملاّ ازم کے خلاف تھے۔ اتاترک کے مشہور سوانح نگار پیٹرک کنراس نے اتاترک پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اتاترک نے کورین لطفو کو فرانسیسی زبان میں گیلی پولی کے محاذ سے خط لکھا۔ ''خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے فوجی، دشمن کی نسبت کہیں زیادہ بہادر اور مزاحمت کار ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی کامریڈ شپ میرے احکام کی بجا آوری میں سہولت دیتی ہے جو اکثر اوقات موت کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایسا ہونے کی صورت میں، اس

کے صرف دو ساوی یا جنتی نتائج نکل سکتے ہیں۔ فاتح غازی بنا یا پھر شہید۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس دوسرے لفظ کا کیا مطلب ہے؟ سیدھا جنت میں جانا.....'' (اتاترک، قوم اور جمہوریہ کاظہور صفحہ 125)

یہ ان کا قرآن اور اسلام میں یقین محکم ہونے کا ثبوت ہے۔

پھر خلافت کے خاتمے پر جب ترکی کا اقتدار مصطفیٰ کمال پاشا کے ہاتھ میں تھا تو خلیفہ کی روانگی کے بعد پہلے جمعہ کے دن آیا صوفیہ میں جو خطبہ پڑھا گیا، اس کے الفاظ یہ تھے۔

''اے خدا ہماری ریپبلکن حکومت اور مسلمان قوم کی مدد کیجیے۔ مسلمانوں کی شان وشوکت میں اضافہ فرمائیے اور اسلام کے اس پرچم کو تمام پرچموں میں سربلند کر دیجیے، جو جمہوریہ ترکی پر سایہ فگن ہے اور ان مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کی زندہ مثال پر اپنی زندگیاں بسر کرنے کی توفیق دیجیے۔''

(اتاترک، قوم اور جمہوریہ کاظہور صفحہ 432)

23 اپریل 1920ء کے دن پہلی قوم پرست پارلیمنٹ کی کاروائی کا آغاز جمعۃ المبارک کے روز انقرہ میں حاجی بیرام مسجد کے اندر ہوا۔ اجلاس کی سربراہی تین آئمہ کرام نے کی جو نبی کریم ﷺ کا سبز پرچم تھامے ہوئے تھے۔ عمارت کی چھت پر ترک ریاست کا سرخ پرچم لہرایا گیا، جب کہ سبز پرچم کو قرآن پاک کی ایک آیت مبارکہ کے نیچے لٹکایا گیا تھا۔ اتاترک اس تقریب میں موجود تھے اور اس کے روح رواں تھے۔

ترکی اور برصغیر

مفکر پاکستان علامہ اقبالؒ ترکوں سے بے پناہ محبت اور اخوت رکھتے تھے۔اس لیے جب یکم اکتوبر 1916ء کو شریف مکہ حسین ترکوں کے دشمن انگریز کے دام سحر میں پھنس کر ترکوں کے خلاف محاذ میں شامل ہو گیا اور انگریزوں کی چال کے تحت حجاز کا بادشاہ بننے کا اعلان کیا تو اقبال نے اسے غداری کہا۔عثمانی خلافت سے اس غداری پر انھوں نے کہا۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے

کوئی بھی مسلمان اپنے مذہب کو بیچنے کے جرم کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر شریف حسین تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے خونی نسبت کا دعویٰ بھی کرتا تھا۔وہ کس طرح اسلام دشمن قوتوں کا خلافت اسلامیہ کے خلاف مہرہ بن گیا۔عرب اسلام دشمن استعماری قوتوں کے ساتھی بن کر مسلمان ترکوں کا خون بہانے پر کیسے آمادہ ہو گئے۔شاعر یعنی اقبالؒ اس غم والم کو خضر علیہ السلام کی زبان اس طرح نوحہ خواں ہیں۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسیا بن گئی خاکِ حجاز

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز!
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
گفت رومیؒ ہر بنائے کہنہ کہ باداں کنند
می ندانی اول آں بنیادِ راویراں کنند

پھر بانگ درا میں علامہ اقبال خبردار کرتے ہیں۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خون مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابِی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر
تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر!
اے کہ نشناسی خفی را ازجلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکر و علی ہشیار باش

انگریزوں نے ترکوں کے خلاف عرب نیشنلزم کا شوشہ چھوڑ کر مسلمانوں میں نا اتفاقی پیدا کر دی۔ علامہ اقبالؒ نے اسی پر مسلمانوں کو خبردار کیا تھا۔

مشہور مشرق شناس ڈاکٹر این میری شمل ''جاوید نامہ'' کے ترکی ترجمہ میں لکھتی ہیں۔

''اقبال کو ترکی کو قریب سے دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ چنانچہ وہ یہ نہیں جان سکے کہ اتاترک کے انقلابات محض ملک میں پائے جانے والے انتہا پسند رویوں کے خلاف ایک جدوجہد ہے نہ کہ اندھا دھند مغرب کی تقلید''۔

ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' میں لکھتے ہیں کہ علامہ

اقبال کی وفات سے چند ہفتے قبل جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے اطلاع دی کہ ان کی صحت یابی اور درازی عمر کے لیے ڈربن کی تمام مساجد میں دعا کی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے انھیں جواب دیا کہ ''میں تو اپنا کام اب ختم کر چکا ہوں۔

اگر درازی عمر کی دعا کرنی ہے تو کمال اتاترک اور جناح کے لیے کرو''

علامہ اقبال کے ان خیالات سے معلوم ہوتا ہے آہستہ آہستہ انھیں کمال اتاترک کے خلاف پروپیگنڈے کی حقیقت معلوم ہوگئی تھی۔ درحقیقت ترکی میں جو دینی اصلاحات ہو رہی تھیں انھیں غلط رنگ دے کر ترکوں کے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا۔ جب علامہ اقبال کمال اتاترک کی پالیسیوں کو صحیح طور پر سمجھ گئے تو وہ ان کے حامی ہو گئے۔

اقبال کے نزدیک اپنے پیرومرشد کے مزار کا ترکی میں ہونا ترکی کو ایک خاص اہمیت بخشتا تھا اور ان کے دل میں ترکی سے محبت میں اضافے کا باعث بنا ہوا تھا۔ محمد عاکف اور صوئے کے داماد عمر رضا دوغرول نے قونیہ میں مولانا رومؒ اور اقبالؒ پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اس لیکچر میں انھوں نے محمد عاکف کے نام اقبال کے ایک فارسی خط کا حوالہ دیا ہے، جس میں علامہ اقبال نے لکھا ہے۔

''ترک قوم اور جدید ترکی سے مجھے بڑی محبت ہے۔ ایک دن ترکی بالخصوص مولانا رومیؒ کے قونیہ میں موجود مقام اقدس کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس بات کا بڑا نیازمند ہوں کہ ترکی کی زمین مجھے مولانا رومیؒ کے ایک ناچیز مرید کے طور پر قبول کرے۔ مجھے اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک گلستان دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے درمیان بھڑکتی ہوئی آگ ہے اور میں پروانوں کی طرح اس آگ کی طرف بھاگ رہا ہوں۔ وہ آگ ہے رومیؒ کا عشق اور محبت۔''

علامہ اقبال کو ترکی سے آنے والے لوگوں سے ملنے کی ہمیشہ خواہش رہتی تھی۔ رؤف بے جب دہلی آئے تو اقبال لاہور سے دہلی انھیں ملنے گئے۔ انھوں نے رؤف بے کے اعزاز میں منعقدہ جلسے کی صدارت بھی کی۔

خالدہ ادیب خانم جب ہندوستان آئیں تو علالت کے باوجود علامہ اقبال ان سے ملنے گئے، کیوں کہ یہ آزاد منش ترک تھے، جن سے عالم اسلام کی نجات کی خاطر کچھ امید کی جا سکتی تھی اور علامہ نے آخر دم تک اس امید کو برقرار رکھا۔ انھوں نے ترکوں کے متعلق تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں کہا۔

''دراصل صرف ترک ہیں جو امم اسلامیہ میں قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعور

ذات کی نعمت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ صرف ترک ہیں، جنھوں نے ذہنی آزادی کا حق طلب کیا ہے اور جو ایک خیالی دنیا سے نکل کر اب عالم حقیقت میں آ گئے ہیں۔''

میں ترکی میں جہاں جہاں مسجدوں اور ان کے نزدیک قدیم مدرسوں میں گیا، مجھے مسجدیں تو آباد نظر آئیں لیکن پرانے مدرسے خستہ حالت میں خالی نظر آئے۔ وہاں اب مساجد کے امام مدرسوں سے پڑھ کر نہیں آتے، بلکہ ایک مشترکہ سلیبس والے تعلیمی اداروں سے اسلامی تعلیمات حاصل کرتے ہیں۔ ترکی میں بھی پہلے پاکستان جیسے مدارس ہوتے تھے جو مختلف فرقوں کی نمایندگی کرتے تھے اور قومی وحدت کے لیے اس طرح نقصان دہ ہوا کرتے تھے جیسے کہ پاکستان میں ہیں۔

مصطفیٰ کمال اتاترک کی اصلاحات کے بعد اب ترکی میں صرف ایک ہی فقہ یعنی حنفی فقہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس لیے وہاں مذہبی ہم آہنگی ہے، وہاں اسلام کے نام پر فرقہ بندی نظر نہیں آتی، جس کی وجہ سے ترک قوم ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے دنیا میں بلند مقام کی حامل ہے۔

علامہ اقبال تشکیل جدید الہیات اسلامیہ میں کہتے ہیں۔

''آیئے اب ذرا ترکوں کے مذہبی اور سیاسی فکر کا مختصر جائیزہ لیں تا کہ اس امر کا بھی اندازہ ہو جائے کہ ترکی کے جدید طرز فکر، علی ہذا سیاسی سرگرمیوں نے حال ہی میں جو صورت اختیار کی ہے اس میں ان کی قوت اجتہاد کا اظہار کس طرح ہوا۔ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے جب ترکی فکر نے دو راستے اختیار کر رکھے تھے، ایک وہ جن کی نمایندگی حزب وطنی نے کی دوسرا حزب اصلاح مذہبی کا راستہ......''

آگے چل کر علامہ فرماتے ہیں۔

''دراصل ترک وطن پرستوں نے ریاست اور کلیسا کی تفریق کا اصول مغربی ریاست کی تاریخ افکار سے اخذ کیا۔ مسیحیت کی ابتدا کسی وحدت سیاسی یا مدنی کے طور پر نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک نظام رہبانیت تھا جو اس ناپاک دنیا میں قائم کیا گیا اور جس کا اس لیے امور مدنی میں کوئی دخل نہیں تھا۔ لہٰذا جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے وہ ہر معاملے میں رومی حکومت کے زیر فرماں رہی، مگر پھر اس صورت حالات میں جب آگے چل کر اسے ریاست کا مذہب قرار دیا گیا تو ریاست اور کلیسا دونوں نے دو حریف قوتوں کی شکل اختیار کر لی اور ان کے حدود و فرائض کے تعین میں ایک نہ ختم ہونے والی بحث شروع ہو گئی۔ لیکن اسلام میں ایسی صورت حال نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اسلام کا ظہور ہی بطور ایک اجتماعی مدنی کے ہوا اور قرآن مجید کی بدولت اسے صاف اور سادہ قانونی اصول مل گئے۔''

آگے چل کر علامہ اقبال اپنے لیکچر میں کہتے ہیں۔

''اپنی ذاتی حیثیت سے البتہ میرا خیال ہے کہ ترکوں کا یہ نقطہ بالکل درست ہے۔ اتنا درست کہ اس کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لیے کہ ایک تو جمہوری طرز حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ ثانیاً اگر ان قوتوں کا بھی لحاظ رکھ لیا جائے تو جو اس وقت عالم اسلام میں کام کر رہی ہیں تو یہ طرز حکومت اور بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔''

یہ حقیقت ہے کہ تین چوتھائی صدی پر محیط تلخ تجربات کے بعد اکیسویں صدی میں ترکی میں جمہوریت کی جڑیں اس وقت خاصی مضبوط ہو چکی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ترکی معاشی اور سماجی ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کر رہا ہے۔ ترکی اب دنیائے اسلام میں ایک شان دار مثال پیش کر رہا ہے جس سے اسلامی ممالک اور تیسری دنیا کے ممالک کو سبق لے کر فلاح کی طرف گامزن ہونا چاہیے۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح بھی ترکوں کے پرجوش حامی اور بہی خواہ تھے۔ وہ بھی علامہ اقبال کی طرح تحریک خلافت میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ قائداعظم اتاترک کمال مصطفیٰ کے مداح تھے۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ انھوں نے اتاترک کی سوانح حیات کا بہ غور مطالعہ کیا تھا۔ اتاترک کی انگریزی سوانح حیات گرے ولف (Grey Wolf) بھی ان کے زیر مطالعہ رہ چکی تھیں۔ یہ کتاب انھوں نے اپنی بیٹی کو بھی پڑھنے کو دی۔

مصطفیٰ کمال اتاترک کی زندگی بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی سے کافی مماثلت رکھتی ہے۔ اتاترک نے اپنی زندگی قوم کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنی ازدواجی زندگی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔

کمال اتاترک نے پکی عمر میں 1923ء میں شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت تک ترکی غیر ملکی قبضے سے آزاد ہو گیا تھا۔ لیکن قومی تعمیر نو کا بے پناہ مشکل کام ابھی باقی تھا، چنانچہ انھوں نے کہا۔

''ہم سب کے لیے اصل کام تو اب شروع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اب سب سے اہم مقصد قومی اقتدار اور وحدت کو حقیقی طور پر حاصل کرنا ہے۔ ہمارے لیے اب صرف ایک اتھارٹی ہے وہ ہے دل اور ضمیر جس سے سب سے بڑا جذبہ قوم کی بقا ہے۔''

مصطفیٰ کمال اتاترک نے 1923ء میں اپنی عمر سے بہت چھوٹی عمر کی خاتون لطیفہ خانم سے شادی کر لی، مگر ان کی قوم کی تعمیر نو کے مسائل نے ان کی پوری توجہ پوری طرف مملکت کے کاموں میں ہی

لگائے رکھی۔ وہ اپنی نوبیاہتا بیوی کو پوری توجہ نہ دے سکے۔ ان کی بیوی کو یہ شکایت ہی رہی کہ وہ ملکی معاملات میں دیوانگی کی حد تک دن رات لگے رہتے تھے، چنانچہ دو سالوں کے بعد ان کی طلاق ہوگئی۔

قائداعظم کی بیوی رتی بائی (اسلامی نام مریم) کو بھی اس قسم کی شکایات تھیں کہ ان کے شوہر ان کو وقت نہیں دے پاتے تھے۔ اس طرح شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی ان کے درمیان علیحدگی کی صورت پیدا ہوگئی اگرچہ طلاق کی نوبت نہ آئی تھی۔

مدینہ اور جنرل فخری پاشا

جنگ کے زمانے میں حرمین الشریفین کے دفاع کے لیے ترکوں کا رول بے مثال رہا ہے۔
مثلاً عثمانی وزیر جنگ انور پاشا نے اپنے بہترین جنرل فخری پاشا کو مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے چنا۔

ترکی اور اتحادی اقوام کے درمیان جنگ بندی کے ایک معاہدے کے مطابق حجاز میں موجود تمام ترک افواج کو اپنے قریبی اتحادی کمانڈر یا عرب نمائندے کے سامنے ہتھیار ڈالنے کو کہا گیا تھا، لیکن مدینہ منورہ کے محاذ کے کمانڈر، جنرل فخری پاشا نے اس حکم کو نظر انداز کر دیا اور کہا کہ جب تک خلیفۃ المسلمین کی طرف سے واضح حکم نہیں ملے گا وہ سرینڈر نہیں کریں گے۔

مصر سے برطانوی ہائی کمشنر سرونگٹ نے فخری پاشا کو لکھا ''اگر آپ نے ہتھیار نہ ڈالے تو تمام خون خرابے کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔'' انھیں پندرہ دسمبر تک ہتھیار ڈالنے کو کہا گیا۔

پندرہ دسمبر کی آخری تاریخ آئی اور گذر گئی۔ انگریز جنرل کے مطالبہ پر فخری پاشا نے ترکی زبان میں لکھا۔

''جناب جنرل ریجنلینڈ ونگٹ! میں عثمانی ہوں، میں محمدی ہوں، میں بیار بیگ کا بیٹا ہوں۔
میں سرینڈر نہیں کروں گا۔''

حالات خراب ہونے پر جنرل فخری پاشا حجرہ مطہرہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر داخل ہو گئے اور کسی طور باہر آنے کو تیار نہ تھے، مگران کے کچھ ساتھی دشمنوں سے مل گئے تھے۔ بہادر ترک جنرل نے دوراتیں اور درمیانی دن حجرہ مطہرہ صلی اللہ علیہ وسلم میں درود وسلام اور نماز وعبادت میں گذارے۔ وہ مدینہ میں تین سال سے حالت جنگ میں ڈٹے ہوئے تھے۔ عالم جذب ومستی میں تھوڑی دیر کے لیے فخری پاشا پر نیند غالب آ

گئی۔اس وقت گھات لگائے سازشی ٹولے نے اس جری مجاہد کو گھیر کر شریف مکہ کے بیٹے علی کے حوالے کر دیا۔

مدینہ میں 10 جنوری 1919ء کے دن صف باندھے ترک سپاہیوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔اندر مقصورہ شریف میں جنرل فخری پاشا نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو درود وسلام پیش کیا۔انھوں نے اپنے گلے میں حمائل تلوار اتاری اور اپنے آنسو اور تلوار دونوں ایک ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور ڈال دیے۔

فخری پاشا کے ساتھ 456 ترک افسران اور 9364 جوان بھی روتے ہوئے در رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روانہ ہوئے۔

غازی اشرف بیگ

عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت کے دنوں میں ترک بریگیڈیئر جنرل اشرف بیگ کی شجاعت کی داستان بھی بے مثال ہے۔ حافظ قرآن اشرف بیگ وزیر جنگ انور پاشا کا زور بازو تھا۔ مدینہ منورہ کے منتظم عثمان پاشا جب اشرف بیگ سے ناراض ہوئے تو اشرف بیگ فرار ہو کر مقامی بدوؤں میں گھل مل کر رہنے لگے۔ مگر انور پاشا نے اشرف بیگ کو ایک اہم مہم پر چالیس جانبازوں کے ساتھ صنعا روانہ کر دیا۔ اشرف بیگ نے خیبر کی راہ کو محفوظ سمجھتے ہوئے یمن کا راستہ لیا۔ شتر سواروں اور خدمت گاروں سمیت ستر آدمیوں پر مشتمل یہ کارواں خیبر کے نزدیک پڑاؤ کے لیے رکا۔

اسی دوران اطلاع پر شریف مکہ کا بیٹا عبداللہ بن حسین قبائل پر مشتمل بارہ ہزار سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ مدینہ منورہ کے محاصرے اور حجاز ریلوے کو تباہ کرنے کے لیے نزدیک خیمہ زن ہوا۔ اس کو اطلاع ملی کہ ٹیلے کی روٹ میں ترک فوج موجود ہے۔

عبداللہ نے گھڑ سوار فوج کے ساتھ تین اطراف سے اشرف بیگ اور اس کے چھوٹے سے جانباز دستے پر حملہ کر دیا۔

اشرف بیگ نے اپنے چالیس سپاہیوں سے کہا ''میں تو اسلام کے نام پر ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے شہادت کو ترجیح دوں گا۔ میدان سے بھاگنا میری حمیت کے خلاف ہے۔ تم تعداد میں بہت کم ہو تم سب جا سکتے ہو۔'' لیکن اس کے جانباز ترک ساتھی بھی ڈٹ گئے اور انھوں نے عبداللہ کی گھڑ سوار فوج کا پانچ گھنٹے تک سخت مقابلہ کیا اور عبداللہ کی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔

عبداللہ نے ایک بار پھر بدوؤں پر مشتمل ہزاروں کی تعداد میں پیادہ فوج بھیجی۔ مشین گنوں

اور گولوں کی گونج دار آوازوں کے ساتھ میدان کارساز میں ڈٹے، ترک شہادت سے ہم کنار ہوئے۔ صرف چار آدمی زندہ بچے۔ اشرف بیگ زخمی ہو کر زمین پر پڑے رہے۔ اگلی صبح عبداللہ کی فوج نے مال و اسباب لوٹا جس میں وہ تحفے بھی تھے جو اشرف بیگ امام یمن کے لیے لے جا رہے تھے۔ زخمی اشرف بیگ کو مکہ مکرمہ بھجوا دیا گیا۔

اشرف بیگ کی گرفتاری برطانوی حلقوں میں بھی زبان زد عام تھی، کیوں کہ جنگ بلقان میں پرنس مورس بلغاری کے فوجی دستوں کو تہس نہس کرنے پر اشرف بیگ اور اس کے جانباز فوجی دستے کے چرچے زبان زد عام تھے۔ ترکوں کی تاریخ ایسے بہت سے واقعات سے بھری پڑی ہے، جن کا مکمل احاطہ اس وقت نہیں کیا جا سکتا۔

ترکی کی اسلام سے محبت اور جرات و شجاعت دنیا کی تاریخ میں ایک درخشاں باب ہے جو ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے روشن مثال بنا رہے گا۔

علامہ اقبال، حجاز سے ترک بالا دستی کے خاتمے پر خاصے ناخوش تھے اور آل سعود کے لیے برطانوی حمایت پر اس طرح ناراض تھے، جس طرح وہ ترک عوام کے خلاف برطانوی حکمت عملی کے ناقد تھے۔ ترکی اور ایران کی تاریخی تبدیلیوں پر علاّمہ نے اس طرح کہا۔

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفیٰ، نہ رضا شاہ میں نمو اس کی کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

جب مصطفیٰ کمال پاشا کی حکومت نے ملک کو سیکولر طریقوں پر ڈھالنا شروع کیا تو علامہ نے کہا۔

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

استنبول۔ شہرِ بے مثال

استنبول ایک ایسا شہر ہے جو دنیا میں اپنا انوکھا مقام رکھتا ہے۔ ویسے تو ترکی سیاحت کی جنت کا درجہ رکھتا ہے، لیکن ہمیں استنبول کی کشش بطور خاص کھینچ لائی تھی۔

استنبول کا قدیم نام زار مراد تھا۔ بعد میں اسے میکلا گارڈ (Mycla Gard) کہا جانے لگا۔ تیسری صدی عیسوی میں رومی بادشاہ قسطنطین (Constantine) نے اسے اپنا پایہ تخت بنا دیا، چنانچہ اس کے نام پر اسے قسطنطنیہ (Constantinople) کہا جانے لگا۔ قدیم عرب تاریخ میں اس شہر کو مدینۃ الروم کہا جاتا تھا۔ یہ گیارہ سو سال تک سلطنت روم کا دارالحکومت رہا تھا۔ جب ترک مسلمانوں نے اسے فتح کیا تو اسے اسلام بول یعنی اسلام آباد کہا جانے لگا۔ اسلام بول کی تبدیلی صورت استنبول بن گئی۔ ترکوں کی فتح سے پہلے یہ شہر مشرقی کلیسیا کا مرکز تھا، جس کے سربراہ کو بطریک (Patriarch) کہا جاتا تھا۔

قسطنطنیہ کو روم کے بادشاہ کونسٹین نے نئے روم کا نام دیا، جس کے لیے اس نے ساڑھے چار میل لمبی دیوار بنائی گئی، جس کی اونچائی تیس فٹ اور چوڑائی سولہ فٹ تھی یہ دیوار اس قدر مضبوط تھی کہ عربوں کے نصف درجن حملوں سے بھی یہ شہر فتح نہ ہو سکا۔

استنبول میں گولڈن ہارن (Golden Horn)، آبنائے باسفورس اور مرمرہ سمندر آپس میں ملتے ہیں۔

باسفورس کے ذریعے بحرہ اسود اور بحر اوقیانوس کا بھی ملاپ ہوتا ہے۔

عرب مسلمانوں کی ایک عرصہ سے کوشش تھی کہ قسطنطنیہ فتح ہو کر اسلامی شہر بن جائے۔ اس مقصد کے لیے کئی کوششیں کی گئیں۔ ایک لشکر میں تو صحابی رسول حضرت ایوب انصاریؓ بھی تھے۔ شہر تو فتح نہ ہو سکا لیکن شہر

کے محاصرے کے دوران حضرت ایوبؓ ۔ انتقال فرما گئے اور انھیں شہر کے باہر دفن کر دیا گیا۔ ان کا مزار اس وقت مرجع خلائق ہے۔ مسلمانوں نے 18-717ء میں مسلیمہ کی قیادت میں ایک اور بڑا حملہ کیا، جس میں انھوں نے سمندری جہاز بھی استعمال کئے لیکن کامیابی نہ ہو سکی، مگر نہ جانے کیوں عربوں کو فاتح قسطنطنیہ کہا جانے لگا۔

اس شہر کو آل عثمان کے نوجوان خلیفہ نے خشکی پر سمندری جہاز چلانے کا کارنامہ سرانجام دے کر فتح کر لیا۔ سلطان محمد دوئم کو شوق تھا کہ وہ بھی اس قسم کی فتوحات کرے جو سکندر اعظم یا جولیس سیئرز نے کی تھیں۔ اس لیے وہ قسطنطنیہ کو فتح کرنا بے حد ضروری سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے پندرھویں صدی عیسوی میں ایک بڑی اور تربیت یافتہ فوج تیار کی۔ اس فوج کے جنیسری (عیسائی، غلاموں پر مشتمل فوج) کے جوان یورپ میں جنگی لحاظ سے بہترین سمجھے جاتے تھے۔ سلطان نے پہلی دفعہ اتنی بڑی توپیں بنوائی تھیں جو 1500 پاؤنڈ وزنی گولا پھینک سکتی تھیں۔

ادھر قسطنطنیہ کے بازنطینی بادشاہ کو اٹلی کے کرائے کے فوجیوں کے ساتھ ساتھ بڑی بحری قوت وینس (Venice) اور دیگر یورپی ممالک کی مدد بھی حاصل تھی۔

ترکوں نے اپریل 1453ء میں بڑا حملہ شروع کیا، لیکن وہ شہر کی انتہائی مضبوط دیوار نہ توڑ سکے اور نہ ہی اسے عبور کر سکے۔ اب صرف سمندر کی طرف سے ہی حملہ کر کے کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی، لیکن شہر کے نزدیک پہنچنے کے لیے آبی بندرگاہ گولڈن ہارن کا آبی دہانہ یونانیوں نے ایک دیوہیکل زنجیر لگا کر بند کر رکھا تھا۔ زنجیر کی رکاوٹ سے بچنے کے لیے ترکوں نے ایک انتہائی انوکھی ترکیب سوچی۔ انھوں نے لکڑے کے بڑے بڑے تختوں پر چربی لگا کر پھسلن تیار کی اور سمندری جہازوں کو دھکا لگا کر زمین پر چڑھا دیا اور انھیں کھینچ کر سمندری زنجیر کی دوسری طرف جہازوں کو پانی میں اتار دیا۔ اس طرح ترکوں کی بحری توپوں نے قسطنطنیہ کی دیواروں اور بڑے دروازوں کو توڑ دیا۔ زمین پر ترک بحری جہازوں کو چلتا دیکھ کر بازنطینیوں کے حوصلے تو پہلے ہی پست ہو چکے تھے اس لیے شہر با آسانی فتح ہو گیا۔ بازنطینی بادشاہ لڑتے ہوئے مارا گیا۔ قسطنطنیہ کی فتح سے مسلمانوں کا سات سو سال پرانا خواب پورا ہو گیا اور بازنطینی مملکت کا وجود بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

قسطنطنیہ کے محاصرے اور جنگ میں جو بنوامیہ کے زمانے میں ہوئی پہلی دفعہ سمندری جہاز استعمال ہوئے تھے۔ جب چند سال پہلے حضرت عثمان کی خلافت کے زمانے میں شام کے گورنر امیر معاویہ نے کثیر رقم خرچ کر کے سمندری جہازوں کی تعمیر شروع کرا دی تھی۔ جس کی حضرت عثمانؓ

سے اجازت نہیں لی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے حضرت عثمانؓ کو اس امیر ترین صوبے سے سالانہ خراج آنا بند ہو گیا، چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے سے مصر، کوفہ اور دیگر علاقوں میں حضرت عمرؓ کے زمانے سے بنائی گئی چھاؤنیوں میں موجود سپاہیوں کو وظیفے ملنا بھی بند ہو گئے۔ ادھر فتوحات کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا اس لیے ان سپاہیوں کو مالِ غنیمت ملنا بھی بند ہو چکا تھا۔ یہی وہ سپاہی تھے جو باغی ہو کر مدینے میں خلیفۃ المسلمین حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور ان کا گھیراؤ کر لیا۔ کئی دنوں کے گھیراؤ کے بعد بھی حضرت عثمانؓ کے پاس صوبوں سے رقوم نہ پہنچیں جو وہ ان باغیوں کو دے سکتے۔ بالآخر باغی سپاہیوں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔

660ء سے عرب قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوشش میں نکلے ہوئے تھے، لیکن ان کے زمینی حملے قسطنطنیہ کی مضبوط دیواروں اور مضبوط عیسائی فوج کی وجہ سے ناکام رہے تھے۔

جب قسطنطنیہ کے حکمران تھیوڈوسیس سوئم (Theodosis III) چرچ میں راہب بن کر اقتدار سے علیحدہ ہو گیا تو اس کے بعد عیسائی سلطنت کا قابل ترین حکمران لیو سوئم ((Leo III برسر اقتدار آ گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ عرب زمینی حملے کر کے تو قسطنطنیہ کو فتح نہیں کر سکتے تھے اور اگر کوئی خطرہ ہو سکتا تھا تو وہ سمندر کی طرف سے ہو سکتا تھا، چنانچہ اس نے اپنی بحری فوج کو بہتر طریقے سے منظم کرنا شروع کر دیا۔

اور چیزوں کے علاوہ لیو سوئم نے بحری جنگ کے لیے ایک ایسا خطرناک ہتھیار بنا لیا جس نے تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ یہ ایک ایسا گولا تھا، جسے عربوں کے جہازوں پر گرایا جاتا تھا اور جس کے گرتے ہی وہ ایک خوفناک آگ لگا دیتا تھا اور جب اسے بجھانے کے لیے پانی استعمال کیا جاتا تو اس کی آگ مزید بھڑک اٹھتی تھی اس طرح لکڑی کا بنا ہوا جہاز جل کر بھسم ہو جاتا تھا۔ اس گولے میں کون کون سے کیمیائی اجزا تھے ایک بڑا راز ہی رہا۔ اس طرح عربوں کا بحری بیڑا تباہ ہو کر رہ گیا۔ بحری شکست کے بعد عربوں نے اپنی توجہ زمینی حملوں کی طرف مبذول کر لی اور تقریباً 80,000 فوجیوں کے ساتھ انھوں نے قسطنطنیہ کا زمینی محاصرہ سخت کر دیا جو طول کھینچ گیا اور شہر کی فصیل نہ توڑی جا سکی۔

جب سردی کا موسم آیا تو عرب فوج کو بے انتہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اور ان کے خیمے اس شدید سردی کے لیے تیار نہیں تھے۔ فوج کے سربراہ کے جوان بھی فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے کہا جاتا ہے کہ وہ فوجی مقاصد میں کام دینے والے تمام جانوروں کو بھی کھا گئے۔ یہاں تک کہ وہ گندگی تک کھانے پر

مجبور ہو گئے۔اس طرح وہ بیماریوں کا بھی شکار ہو گئے۔

718ء کے موسم بہار میں عربوں کو مصر کی طرف سے کچھ کمک مل گئی۔لیکن قسطنطنیہ کے بادشاہ لیو III نے اپنی بحری قوت استعمال کر کے مسلمان فوجوں کے عقب میں اپنی فوجیں اتار کر زمین پر انھیں بہت نقصان پہنچایا اور مصر سے آئی ہوئی مسلمان فوج کے سربراہ مردسان بھی دوسرے سپاہیوں کے ساتھ شہید ہو گیا اور قسطنطنیہ فتح نہ ہو سکا۔

اسی دوران لیوسوئم نے بلغاری فوج کو اپنے ساتھ ملا لیا۔اس طرح دو عیسائی فوجوں نے مشترکہ طور پر شدید حملہ کر کے تقریباً 22000 مسلمان فوجیوں کو شہید کر دیا۔اس کے ساتھ لیوسوئم نے عربوں کی فوج میں یہ افواہ پھیلا دی کہ یورپ سے مزید فوج ان کے لڑنے آرہی ہے۔اس طرح ان کے حوصلوں کو مزید پست کر دیا چنانچہ مسلمان مزید لڑائی کے لیے تیار نہ تھے۔

اموی خلیفہ امیر معاویہ نے ارض روم پر سولہ مرتبہ فوج کشی کی۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔''ایک لشکر سردیوں میں جاتا وہ واپس آتا تو دوسرا گرمیوں میں جاتا اور وہ واپس آتا۔

قسطنطنیہ پر عربوں کا پہلا حملہ 48 ہجری میں ہوا۔جس کے سربراہ امیر سفیان ابن عوف تھے یہ کثیر التعداد لشکر تھا۔ایک روایت کے مطابق یہ لشکر بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ مسلمان قسطنطنیہ کے دروازہ زریں (Golden Gate) پر حملہ آوار ہوا۔قسطنطنیہ کے کچھ لوگ دروازے کے باہر آ گئے۔ یہ غالباً کچھ پادری تھے۔ابن حجر نے ان کی طرف سے ایک مکالمہ لکھا ہے''ہماری کتابوں میں تو یہ ہے کہ تم مسلمان قسطنطنیہ فتح کرو گے۔اب معلوم نہیں تم نے حساب میں کچھ غلطی کی ہے یا تم وقت سے پہلے حملہ کر بیٹھے ہو۔''

چنانچہ یہ اور اس کے بعد متعدد حملے بھی قسطنطنیہ کو فتح نہ کر سکے۔

ایک حدیث رسولؐ جو باب ''رکوب البحر'' میں پائی جاتی ہے نبی کریمؐ نے فرمایا'' مجھے خوش گوار تعجب ہوا کہ میری امت کے کچھ لوگ (جہاد کے لیے) سمندر میں ایسے سوار ہو کر جا رہے ہیں جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھے ہوں۔''

عربوں کی بحری طاقت تو قابل ذکر نہ تھی یہ ترکوں کے اس بحری بیڑے کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس نے قسطنطنیہ کی فتح میں تاریخی کردار ادا کیا تھا۔

چنانچہ حدیث کے مطابق مغفرت کی بشارت انھی لوگوں کے لیے تھی جنھوں نے رومیوں کے خلاف سمندری راستے سے جہاد میں حصہ لیا تھا اور قسطنطنیہ کو حدیث رسول مقبولؐ کے مطابق فتح کیا تھا اور

یہ عثمانی ترک تھے۔

عربوں کی 52 ہجری کے گرمائی حملے کے سالار بھی سفیان بن عوف تھے، جس میں حضرت ایوب انصاریؓ لشکر کے ساتھ تھے اور قسطنطنیہ کی فصیل کے نزدیک کچھ فاصلے پر ان کی وفات ہوگئی تھی۔

بالآخر عربوں نے ایک سال کے محاصرے کے بعد قسطنطنیہ کا محاصرہ اٹھا لیا اور خوفناک شکست کے بعد واپس چلے گئے، بلکہ اناطولیہ کا فتح کیا ہوا علاقہ بھی مسلمانوں نے کھو دیا۔

لیوسوئم نے فتح کے بعد عربوں کا پیچھا کیا اور انھیں پورے اناطولیہ سے پوری طرح نکال دیا۔ اس طرح مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ ختم ہوگیا، اگر عربوں کو قسطنطنیہ پر شکست کا سامنا نہ ہوتا تو مشہور مورخ گبن کے بقول مسلمانوں کو اس وقت یورپ کو فتح کرنے سے روکنے والا کوئی نہیں تھا اور شاید موجودہ فرانس، جرمنی اور اٹلی کی ریاستیں بھی وجود میں نہ آسکتیں۔ ایک روسی مورخ کے بقول عربوں کی قسطنطنیہ کی شکست نے نہ صرف بازنطینی ریاست اور عیسائی دنیا کو بچا لیا بلکہ پوری مغربی تہذیب بھی بچ گئی۔

ترکوں کے ذریعے فتح کے بعد استنبول پانچ سو سال تک عالم اسلام میں مرکزیت کا مقام رہا اور سلطنت عثمانیہ 1299ء سے لے کر 1922ء یہاں قائم رہی۔ علامہ اقبالؒ نے اس شہر پر یہ لکھا۔

صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے آستانِ مسند آرائے شہہ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا تربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا

ابن جبیر اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ قسطنطنیہ کا عیسائی شہزادہ ولیم اپنی چچازاد لڑکی کے بے مثال حسن کی وجہ سے اس پر اس قدر فریفتہ تھا کہ وہ اس سے ہر قیمت پر شادی کرنا چاہتا تھا، مگر اہل روم اور عیسائیوں میں قرابت کے خونی رشتہ داروں کے مابین شادی نہیں ہوسکتی، چنانچہ مضبوط کلیسا آڑے آگیا اور اس نے اس کی مکمل طور پر ممانعت کردی۔

ولیم مجبور ہو کر اس لڑکی کو لے کر ضارب کے مسلمان فرمانروا امیر مسعود کے پاس چلا گیا اور اس کی موجودگی میں اس نے شادی کرنے کے لیے مذہب اسلام قبول کرلیا۔ اس موقع پر رسم کے طور پر ایک سنہری صلیب کو آگ میں تپایا گیا جو ولیم نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالی۔

ولیم مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ رہنے لگا اور جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے حصہ لیتا رہا۔ آخر میں وہ اسلامی فوجوں کے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوا۔

مزار حضرت ایوب انصاریؓ

استنبول میں ہمارے میزبان حسن صاحب اور ان کی اہلیہ نے اپنی کار میں ہمیں چند اہم جگہوں اور باسفورس کی سیر کرائی۔ پھر وہ ہمیں زیارت کے لیے حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار پر لے گئے۔ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ خوش نصیب صحابی تھے، جن کے گھر کے آگے آپؐ کی اونٹنی مدینہ پہنچنے کے بعد بیٹھ گئی تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انؓ کے گھر میں قیام کا فیصلہ کیا۔

حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار نسبتاً چھوٹے گنبد والی عمارت میں ہے جہاں زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ دور دراز سے لوگ بال بچوں سمیت حاضری دیتے ہیں۔ مزار پر دلفریب سکون اور روحانیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہاں سفید قمریوں جیسے خوبصورت پرندوں کی موجودگی ماحول کو مزید دلفریب بنا دیتی ہے۔ ہم نے وہاں نفل ادا کئے اور دعا مانگی۔

تاریخی واقعات کے مطابق جب عرب قسطنطنیہ کو فتح کرنے میں ناکام ہو کر واپس چلے گئے تو وہاں کے عیسائیوں نے حضرت ایوب انصاریؓ کی قبر کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔

فتح قسطنطنیہ کے بعد فاتح سلطان محمد نے آپؓ کی قبر کی تلاش شروع کی۔ یہ دو درختوں کے درمیان جھاڑیوں سے تقریباً چھپی ہوئی تھی۔ ایک اور روحانی بزرگ استاد عاق شمس الدین نے اس کی نشاندہی کی تھی۔ حضرت ایوب انصاریؓ کے پہلو میں سلطان احمد پاشا کی قبر ہے جو 1500ء میں بنائی گئی تھی۔

ترکی کا ہر سلطان تخت پر بیٹھنے سے پہلے حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار پر حاضری دیتا تھا۔

دوسرے دن ہم نے حسن صاحب سے کہا کہ وہ آئندہ ہمیں خود انحصار سیاح بننے دیں اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں تا کہ ہم خود گھوم پھر کر استنبول کو دیکھیں، چنانچہ ہم نے ٹیکسیوں اور بسوں میں سفر کر

کے اس شہرِ بے مثال کو دیکھنا شروع کر دیا۔

حفظ ماتقدم کے طور پر حسن صاحب نے ہمیں بتایا کہ عام ترک انگریزی زبان سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے اس لیے اگر کسی جگہ راستہ بھول جاؤ یا بھٹک جاؤ تو عام ترکوں سے اردو زبان میں بات کر کے راستہ پوچھنا وہ کچھ نہ کچھ سمجھ جائیں گے۔ اردو کی ساخت میں ترکی اور فارسی کے خاصے الفاظ ہیں۔ برصغیر ہند میں اردو بطور فوجی زبان کے قائم ہوئی تھی۔ اس لیے کہ مغلوں کی فوج میں ترک اور ایرانی اور وسطی ایشیا کے لوگ خاصی بڑی تعداد میں ہوا کرتے تھے۔ مقامی لوگ بھی ان کے ساتھ تھے ان سب کے لیے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت تھی، چنانچہ اردو وجود میں آ گئی۔

استنبول میں جب ہم توپ کاپی کے علاقے میں پیدل چل رہے تھے تو ایک جگہ ہم نے فوجی چھاؤنی دیکھی۔ اس کے احاطے کے باہر بڑے بڑے الفاظ میں URDU اردو لکھا ہوا تھا۔ یعنی فوج کی چھاؤنی

ہمارے ہوٹل کے آرمینی مالک نے ہمیں اہم مقامات اور بڑی بڑی سڑکوں کے متعلق خاصی معلومات مہیا کر دی تھیں اور مشورہ دیا تھا کہ ہم شہر کی بسوں کو بھی استعمال کریں۔

ہم نے استنبول کی انتہائی خوبصورت مسجد سلیمانیہ دیکھنے کے لیے بس کے ذریعے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ بس میں میرے نزدیک بیٹھے ایک ترک نے میری اہلیہ کا پاکستانی لباس دیکھ کر سمجھ لیا کہ ہم اجنبی ہیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا ''مملکت''؟ یعنی آپ کس ملک سے ہیں۔ میں نے کہا ''پاکستان'' اس پر اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور بس کنڈکٹر سے دو ٹکٹ خرید کر میرے حوالے کر دیئے۔ میں نے انگریزی اور اردو میں احتجاج کرتے ہوئے ٹکٹوں کے پیسے دینے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ نہ مانا اور اگلے سٹاپ اتر گیا۔ یہ ہمارے لیے حیران کن اور نیا تجربہ تھا، جس سے ترکوں کی پاکستان سے یگانگت کا ثبوت ملتا ہے۔

استنبول کی مساجد

مسجد سلیمانی ایک پہاڑی پر اونچائی پر بنائی گئی ہے۔ اس کی تعمیر 1550ء سے 1557ء تک ہوئی۔ اس کے اونچے محل وقوع کی وجہ سے استنبول کا تاج بھی کہا جاتا ہے۔ مسجد کا عظیم الشان گنبد کاشی کے کام میں قرآنی آیات کی خوبصورت لکھائی سے مزین ہے۔ یہ مسجد سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے جس کا جلال و جمال بے مثال ہے۔

جامع احمد جسے یعنی نیلی مسجد Blue Mosque بھی کہا جاتا ہے۔ 1609ء سے 1616ء کے درمیان مکمل ہوئی۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے چھ مینار ہیں، جب کہ دوسری مسجدوں کے چار مینار ہوتے ہیں۔ ایک یہ مسجد حقیقی معنوں میں عظیم ماہر تعمیرات سنان پاشا کا شاہکار ہے۔ ہمارے ہاں کی جاے نمازوں پر بھی اس مسجد کی تشبیہ صدیوں سے بنائی جاتی رہی ہے۔

مسجد کے عظیم الشان ہال کے ایک حصے کو رسی لگا کر سیاحوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے مسجد کے آگے کا حصہ جہاں ممبر و محراب ہے اس کو نمازیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ میں نے وہاں وضو کر کے دو رکعت نفل ادا کئے۔

جب میں سیاحوں والی جگہ جوتے پہننے کے لیے آیا تو ایک امریکی خاتون سیاح نے تجسس کے طور پر مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں عبادت کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کا مونہہ دوسری طرف کیوں تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے اپنا مونہہ خانہ کعبہ کی طرف تھا جو مکہ مکرمہ میں ہے۔ اتفاق سے وہاں ایک دیوار پر خانہ کعبہ کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم نے کی تھی۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے

کہا کہ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ حضرت ابراہیم مسلمان تھے (Do'nt tell me Abraham was a Muslim) میں نے کہا ہاں وہ مسلمان تھے اور حضرت محمد ﷺ ان کی اولاد میں سے ہیں اور یہ کہ ہم حضرت ابراہیمؑ کے بھی پیروکار ہیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے مزید تفصیل سے اسے دین اسلام کے متعلق اپنی اوقات کے مطابق تھوڑا بہت بتایا۔ دراصل یہ اہل مغرب کا قصور نہیں کہ وہ اسلام کے متعلق صحیح معلومات نہیں رکھتے۔ ہم مسلمانوں نے بھی تو اپنے دین کو اس سلسلے میں اپنی نئی پود اور اہل مغرب کو پورے طرح سے اسلام کو دین رحمت کے طور پر متعارف نہیں کرایا۔

مسجد کے برآمدے میں ایک نوجوان مسجد اور ترکی کے دیگر دلچسپ مقامات کے خوبصورت پوسٹ کارڈ بیچ رہا تھا۔ وہ دو ٹانگوں سے محروم ایک معذور شخص تھا۔ میں نے اپنی پسند کے کچھ کارڈ اٹھا کر ان کی قیمت معلوم کی۔ اس نے قیمت بتائی اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا کہ ہم کہاں سے آئے تھے؟ میں نے جب پاکستان کا نام لیا تو اس نے کارڈوں کے پیسے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ آپ پاکستانیوں کے لیے تحفہ ہیں۔ اس معذور اور غریب نوجوان کا خلوص نا قابل یقین تھا، مگر میں نے بھی ضد کی کہ میں یہ کارڈ مفت نہیں لوں گا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے بتایا تب جا کر وہ کارڈوں کی نصف قیمت لینے پر آمادہ ہوا۔ اسی علاقے میں ایک ریسٹورنٹ والے نے بھی ہم سے پاکستانی ہونے کے ناتے کھانے کے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔

استنبول کی دوسری مساجد بھی قابل دید ہیں۔ گلاتا (GALATA) پل کے نزدیک بڑی مسجد رستم پاشا ہے۔ رستم پاشا سلطان سلیمان عظیم کا داماد تھا اور اس کا وزیر اعظم بھی رہ چکا تھا۔

اس سے بھی زیادہ خوبصورت مسجد جامع جمیلہ مہرمہ (Cemile Mihrima) ہے جو سلطان سلیمان کی اکلوتی بیٹی اور رستم پاشا کی بیوی تھی۔ یہ مسجد قدیم شہر کی دیوار سے بہت قریب واقع ہوئی ہے۔ اس مسجد کے عظیم الشان گنبد پر ہلکے رنگوں سے بے حد خوبصورت بیل بوٹے بنائے گئے ہیں اور بڑی خوبصورتی سے قرآنی آیات لکھی گئی ہیں۔ مشہور جرمن دانش ور صوفی خاتون ڈاکٹر این میری شمل (Annemarie Schemel) جسے ترکی اور مولانا روم سے بے حد لگاؤ تھا، نے لکھا ہے کہ یہ مسجد روحانیت اور مادیت کا خوبصورت امتزاج ہے جس کے فن تعمیر میں نسوانیت جھلکتی ہے۔ یہ استنبول کے علاقے اسقودر (Uskudar) میں واقع ہے۔

شہزادی مہرمہ سلطان کی مسجد کے ساتھ ہی ایک عالی شان مدرسہ بھی بنایا گیا تھا، مگر آج کل اس عمارت کو ایک ہسپتال کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس ہسپتال کا نام مہرمہ سلطان میڈیکل سنٹر ہے جو ایک رفاعی ادارہ ہے اور کم آمدنی والے لوگوں کو علاج معالجے کی سہولیات فراہم کرتا ہے۔

اس سے تھوڑے فاصلے پر سلطان سلیمان اعظم کی بیوی حورم سلطان کے نام کی مسجد بھی موجود ہے جو مہرمہ سلطان کی مسجد سے قدرے چھوٹی ہے۔

آیاء صوفیہ

قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد دوئم نے شکرانے کی نماز آیاء صوفیہ کے عظیم الشان چرچ میں ادا کی۔ اس چرچ کو مسجد بنا دیا گیا۔ چرچ میں خوبصورت سنہری موزیک سے بنی حضرت عیسیٰ اور حضرت مریمؑ کی شبیہوں کو پلستر اور بڑے بڑے کتبے لگا کر چھپا دیا گیا۔ لکڑی کے بڑے بڑے کتبوں پر اللہ، محمدؐ اور چاروں خلفاے راشدین کے نام لکھ دیے گئے تھے۔

جب ہم آیاء صوفیہ دیکھنے گئے تو اس وقت پلستر ہٹا ہوا ملا اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی شبیہیں جزوی طور پر نظر آ رہی تھیں۔ آیاء صوفیہ کی بطور مسجد حیثیت اب ختم کر دی گئی ہے۔ اب یہ ایک نادر تاریخی عمارت اور عجائب گھر کی حیثیت رکھتی ہے جو سیاحوں میں بے حد مقبول ہے اور دور دراز سے عیسائی اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

آیاء صوفیہ کو جسے Hagia Sophia بھی کہتے ہیں بازنطینی مملکت کی سب سے بڑی عبادت گاہ تھی۔ عیسائیوں کی پرانی تواریخ میں قسطنطنیہ کی شکست سے زیادہ افسوسناک امر اس بے مثال اور عظیم عبادت گاہ کا مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا جانا تھا جسے عیسائی دنیا ابھی تک نہیں بھول سکی۔

مسلمانوں کا شروع ہی سے یہ کہنا تھا کہ دراصل آیاء صوفیہ تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں ہی کے لیے بنوائی تھی تاکہ اس میں ایک اللہ کی عبادت کی جا سکے۔ مسلمانوں کے نزدیک عام حالات میں اتنے بڑے گنبد کا بن جانا ناممکن تھا۔ عیسائی ماہرین تعمیرات کئی سالوں تک کوشش کرتے رہے کہ آیاء صوفیہ کا یہ گنبد مکمل ہو سکے مگر وہ ناکام رہے۔ کہاوت کے مطابق انھیں ایک آسمانی آواز نے ہدایت کی کہ وہ گنبد کو جوڑنے والے پتھر عربستان سے لے آئیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک کاروان بھیجا گیا جو روایت

کے مطابق اور چیزوں کے علاوہ نبی کریم ﷺ کا لعاب مبارک بھی لایا تھا۔ وہ کاروان مکہ مکرمہ سے کئی ظروف وہاں کی مٹی کے بھر کر لایا اور ستر ظروف آب زم زم کے بھی بھر کر لائے گئے۔ اس طرح آیہ صوفیا کا یہ انتہائی مضبوط اور بڑا گنبد بن سکا۔

دوسری طرف یونانی روایت کے بقول دنیا میں سب سے بڑی ان کی اس عبادت گاہ کا ترکوں کے قبضے میں آنے کے بعد ایک لمبے عرصے تک یہ یقین کیا جاتا رہا کہ ایک دن اس عظیم عمارت آیاء صوفیہ کی دیوار سے ایک خفیہ دروازہ کھلے گا اور اس میں سے ایک فرشتہ نکل کر اس چرچ کو اپنے قبضے میں لے کر مسلمانوں کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔

ایک اور کہاوت کے مطابق نبی کریم ﷺ کی فتح قسطنطنیہ کی پیشین گوئی سے پہلے کئی اولیا اللہ آیاء صوفیہ میں عبادت کر چکے تھے۔

ایک اور روایت کے مطابق آیاء صوفیہ کے دروازے حضرت نوحؑ کی کشتی سے لکڑی لے کر بنائے گئے تھے۔ حضرت نوحؑ کی کشتی طوفان نوح کے بعد ترکی میں جودی پہاڑ پر آ کر رکی تھی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب کوئی سفر پر جانے سے پہلے آیاء صوفیہ میں دو رکعت نفل پڑھ کر سفر کا آغاز کرے گا تو اس کا سفر کامیاب ہوگا۔

آج کل آیاء صوفیہ کے باہر ایک چھوٹے سے باغ میں ایک بہت اہم لائبریری قائم کی گئی ہے اس لائبریری میں قدیم قلمی نسخے بھی رکھے گئے ہیں جہاں دانش وروں کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔

ہم آیاء صوفیہ کے اوپر گنبد کے نزدیک تک چڑھ گئے۔ اس عظیم عمارت کی مضبوط دیواریں اتنی چوڑی اور مضبوط ہیں کہ سیڑھیوں کی چوڑائی دیوار میں سما گئی ہے اوپر چڑھ کر دیکھیں تو دور سے مشہور جامع احمد نظر آتی ہے، جہاں سیاحوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔

توپ کاپی محل

توپ کاپی کا یہ عظیم الشان اور وسیع محل استنبول کے یورپی علاقے میں واقع ہے، جب سلطان محمد دوئم نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس نے 1453ء میں اس مقام پر ایک عظیم الشان محل بنانے کا حکم صادر کیا۔

اس محل کے مرکزی گیٹ کے دونوں طرف دو توپیں رکھی گئی ہیں۔ توپ کا مطلب ترکی میں وہی ہے جو ہمارے ہاں اردو میں ہے اور کاپی گیٹ یا دروازے کو کہتے ہیں۔ اس لیے اسے توپ کاپی محل کہتے ہیں۔ یعنی توپوں کے گیٹ والا محل۔

توپ کاپی کے بڑے مرکزی دروازے کے اوپر فارسی میں خوبصورت اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ میں چونکہ تھوڑی بہت فارسی سمجھتا ہوں اس لیے میں نے وہ اشعار بڑی دلچسپی سے پڑھنا شروع کیا جس پر وہاں آئے ہوئے نوجوان ترک حیران ہوئے۔ انھوں نے پوچھا کہ میں یہ قدیم زبان کیسے پڑھ سکتا تھا۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہ فارسی زبان کے اشعار ہیں جو میں پڑھ سکتا ہوں اور کسی حد تک سمجھ بھی لیتا ہوں، پھر میں نے انھیں ترکی، پاکستان اور ایران کے درمیان مشترکہ ثقافت اور زبانوں میں مشترکہ الفاظ کے متعلق کچھ بتایا۔ وہ بڑی حیرانی سے میری باتیں سنتے رہے۔

توپ کاپی محل چار سو کمروں پر مشتمل ہے۔ یہ ترک سلطانوں کی رہائش گاہ اور کسی حد تک دفتر بھی تھا۔ یہ عمارت 1853ء تک حکمرانوں کے استعمال میں رہی، لیکن خلیفہ عبدالمجید اول نے جب نیا محل بنایا تو اس نے وہاں رہنا شروع کر دیا۔ نئے محل کو دولماباشے کہتے ہیں، چونکہ خلیفہ نے توپ کاپی میں رہائش ترک کر دی تو اتنے بڑے محل کی دیکھ بھال میں بھی کمی آ گئی اور یہ عالی شان محل کھنڈرات میں تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔

جب اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا نے اقتدار سنبھالا تو تب کہیں توپ کاپی محل کی مرمت شروع کی گئی جو سست روی سے چلتی رہی، چونکہ یہ محل اتنا بڑا تھا اس کی مرمت مکمل ہونے میں تقریباً پچاس سال لگ گئے۔

اس وقت توپ کاپی محل ایک بہت بڑا عجائب گھر ہے، اگر چہ محل کے درجنوں ہال اور کمرے ابھی تک بند ہیں۔توپ کاپی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کئی نوادرات بھی موجود ہیں۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار، جبہ، نعلین وغیرہ یہاں محفوظ رکھی گئی ہیں۔آپ ؐ کی مہر جو خطوط اور فرمانوں پر لگائی جاتی تھی وہ بھی یہاں محفوظ ہے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی کرم اللہ کی تلواریں بھی توپ کاپی میں محفوظ ہیں۔ وہاں شیشے کے کیسوں میں عمار بن یاسرؓ، خالد بن ولیدؓ، جعفر طیارؓ اور سعد بن ابی وقاص کی تلواریں بھی سجی ہوئی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مباے مبارک اور اسلامی پرچم صندوق میں بند کر کے یہاں محفوظ کئے گئے ہیں۔

توپ کاپی میں ایک جگہ شیشے کے کیس میں ایک جڑاؤ والا چھوٹا سا ہاتھی بھی رکھا ہوا ہے، جس پر مختلف رنگوں کے قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ یہ ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہ جہاں نے عثمانی خلیفہ اور سلطان کو بطور تحفہ بھیجا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہ اپنے قبضے اور اقتدار کی تائید اور اخلاقی مدد کے لیے ترک خلفا کی طرف ہی دیکھتے تھے اور ان کے لیے بے حد عزت اور احترام ظاہر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر ملکوں کے بے شمار نوادرات بھی توپ کاپی میں سجے ہوئے ہیں۔ ان سب کو تسلی سے دیکھنے کیلیے کئی ہفتے درکار ہیں۔

قدیم بند بازار

استنبول کی ایک اور اہم اور دلچسپی کی جگہ وہاں کا صدیوں پرانا وہ بازار ہے جو اوپر سے پورا چھتا ہوا ہے۔ اسے وہاں کی زبان میں گپالی چار کہتے ہیں۔ اس میں سیکڑوں دکانیں ہیں۔ یہ بازار ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد بنایا تھا۔ یہاں ہر قسم کی چیزیں بکتی ہیں۔ بطور خاص یہ دستکاری کی چیزوں اور زیورات اور نوادرات کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ بازار اس وقت بنایا گیا، جب ترکوں نے استنبول کو فتح کیا تھا۔

مجھے ایک جگہ پیتل اور رنگین شیشوں سے بنا ہوا ٹیبل لیمپ اور توپ کاپی میں رکھے زمرد اور لعل سے جڑے ہوئے خوبصورت خنجر کی نقل بہت پسند آئی۔ دکاندار ایک پڑھا لکھا ترک نوجوان تھا، چونکہ اس بازار میں غیر ملکی یورپین اور امریکی سیاح بڑی تعداد میں آتے ہیں اس لیے یہاں کے دکاندار اچھی خاصی انگریزی بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے جب ان چیزوں کی قیمت دریافت کی تو اس نے پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے بتایا ہم پاکستانی ہیں۔ یہ سن کر وہ چند لمحوں تک خاموش ہو گیا پھر خود ہی بولا ''آپ پاکستانی ہیں۔ میرا دل تو چاہتا ہے کہ یہ چیزیں میں آپ کو بطور تحفہ مفت دے دوں، لیکن چونکہ میں ابھی تک طالبعلم ہوں اس لیے رقم کی ضرورت رہتی ہے، لیکن آپ سے میں کوئی بھاؤ تاؤ نہیں کرنا چاہتا آپ جو دیں گے میں وہ لے لوں گا'' اب میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس نوجوان سے کوئی رعایت نہ کراؤں اور اسے منہ مانگی قیمت دے دوں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں چونکہ تم سے عمر میں بڑا ہوں اس لیے میں بھی قیمت کم نہیں کرانا چاہتا، مگر وہ نہ مانا اور نصف سے بھی کم قیمت پر اس نے وہ چیزیں ہمیں دے دیں۔

استنبول کی بہترین سیر صرف پیدل چل کر ہی کی جاسکتی ہے۔ قدیم اور جدید تاریخ قدم قدم پر بکھری پڑی ہے۔ رومن زمانے کی قدیم شکستہ دیواروں کے حصے آپ کو تصوراتی طور پر پرانے زمانے میں لے جاتے ہیں۔ یہ دیواریں اس زمانے میں واقعی نا قابل تسخیر تھیں اور حقیقی معنوں میں شہر پناہ تھیں، مگر ترکوں نے پہاڑ شکن اسلامی جذبے اور بے مثال شجاعت سے سرشار ہو کر کس طرح ان دیواروں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اسی طرح اور قدیم عمارات کے کچھ حصے ابھی تک موجود ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

پرنسز جزیرے

استنبول کی سیر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس جزیرے کی سیر نہ کی جائے جو مرمرہ سمندر میں کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے چھوٹے جہاز یعنی فیری کے ذریعے جانا ہوتا ہے۔ یہ جہاز گلاتا پل کے پاس سے وقفے وقفے سے چلتے رہتے ہیں۔

ہم نے ایک سیاحتی کمپنی کے توسط سے تقریباً نصف دن تک پرنسز جزیرہ (شہزادی کا جزیرہ) کی سیر کی۔ جزیرہ پر آبادی بہت کم ہے۔ جزیرہ میں گھومنے پھرنے کے لیے قدیم طرز کی گھوڑا گاڑیاں اور بگھیاں استعمال ہوتی ہیں۔ وہاں کار یا کسی اور قسم کی مشینی سواری کی اجازت نہیں ہے۔ بگھی میں بیٹھنے کے بعد آپ اپنے آپ کو صدیوں پرانے ماحول میں محسوس کرتے ہیں ہم نے دوپہر کا کھانا جزیرہ پر کھایا اور واپس استنبول آ گئے۔

ہم چونکہ کافی دن پاکستان سے باہر سیاحت کرتے رہے تھے، اس لیے ترکی میں مزید کچھ دن گذارنے اور اس خوبصورت ملک کی تفصیلی سیاحت اور دیگر علاقوں کی سیاحت کا موقع نہیں تھا۔ میں نے چونکہ ترکی تاریخ اور اس کی اہم جگہوں کے متعلق پڑھ اور سن رکھا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ آیندہ میں اکیلا ہی ترکی آ کر سیاحت کر کے ترکی اور اس کے لوگوں اور تاریخی جگہوں سے اپنے آپ کو روشناس کراؤں گا۔ بطور خاص مجھے مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار پر حاضری دینے اور ازمیر میں انتہائی اہم مقامات کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس کا موقع مجھے تین سال بعد ملا جب میں اکیلا ترکی کی سیاحت کے لیے گیا۔

گالاتا ٹاور

استنبول کی تاریخی عمارات میں وہ تاریخی ٹاور یالاٹ ہے، جسے گالاتا ٹاور کہتے ہیں اور سمندر کے کنارے واقع ہے اور یہ دور سے نظر آتا ہے۔ اس کی نو منزلیں ہیں۔ یہ گولڈن ہارن کے پل سے شمال کی طرف واقع ہے۔ یہ 219 فٹ اونچا ٹاور جب بنا تھا تو اس وقت یہ استنبول کی سب سے اونچی عمارت تھی۔ جب 1348ء عیسوی میں اس کی تعمیر ہوئی تو اس کو حضرت عیسیٰؑ کے نام سے منسوب کیا گیا اور اسے ٹاور آف کرائسٹ (Tower of Christ) کا نام دیا گیا۔ اس کا مقصد اس عظیم الشان بھاری زنجیر کو کنٹرول کرنا تھا جو دشمن کے جہازوں کو گولڈن ہارن کی بندرگاہ تک پہنچنے سے روکنے کا کام دیتی تھی۔ اس رکاوٹ کے باعث ترکوں نے اپنے سمندری جہازوں کو خشکی پر چڑھا کر زنجیر کے دوسری طرف پھر سمندر میں ڈال کر استنبول کی مغربی دیوار اور شہر کے بڑے پھاٹک گولہ باری سے توڑ دیے تھے۔

یہ وہ ٹاور ہے، جس کے اوپر چڑھ کر سترھویں صدی عیسوی میں حضرت احمد چلیبی نے اپنے بازوؤں پر بڑے بڑے پر باندھ کر باسفورس کے اوپر اڑنے کا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ یہ اڑان تقریباً چھ کلومیٹر دور تک ہوئی تھی۔

اس ٹاور سے حسن چلیبی نے 1633ء میں ایک مخروطی راکٹ کے ذریعے اڑان کا تجربہ کیا تھا۔

اس جگہ سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اس ٹاور کے اوپر والے حصے میں ایک نائٹ کلب بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ریسٹورانٹ اور کیفے بھی ہیں۔ رات کے وقت ٹاور کے اوپر سے استنبول کی روشنیاں خوب صورت نظارا پیش کرتی ہیں۔ میں اس ٹاور کی طرف دن کے وقت گیا، مجھے اس کی تاریخی حیثیت نے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

انقرہ

استنبول سے ترکی کے دارالحکومت جانے کے لیے سب لوگوں نے مشورہ دیا کہ سفر کے لیے بسوں کو استعمال کیا جائے۔ یہ بسیں نئی اور بہت آرام دہ ہوتی ہیں اور وقت کی پابندی پر کاربند ہوتی ہیں۔ کئی بسوں میں ایک چھوٹا سا ٹائیلٹ بھی ہوتا ہے، جس سے مسافروں کے لیے ایک اہم ضرورت کا بندوبست ہو جاتا ہے۔ انقرہ، استنبول سے 360 کلومیٹر دور ہے۔

ترک خلافت کے خاتمے کے بعد 1923ء میں ترکی کی نیشنل اسمبلی نے مشورے کے بعد ترکی کے دارالحکومت کو استنبول سے تبدیل کر کے انقرہ منتقل کر دیا۔

انقرہ کا پرانا نام انگورا تھا اس شہر کو 654ء میں عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے فتح کرنے کے لیے محاصرہ کیا، لیکن یہ فتح نہ ہو سکا۔ بعد میں 834ء میں خلیفہ معتصم باللہ کا اس شہر کا محاصرہ بھی ناکام رہا۔ بالآخر یہ شہر 1073ء میں سلجوق ترکوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔

صلیبی جنگوں کے زمانے میں اس شہر کو ریمنڈ IV نے فتح کر لیا، پھر 1101ء سے چودھویں صدی عیسوی تک اس پر منگول حکومت کرتے رہے۔ بالاخر یہ شہر 1403ء میں عثمانی ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔

انقرہ میں میرا ہوٹل شہر کے مرکزی حصے میں تھا اس لیے تمام اہم تاریخی جگہیں پیدل چل کر بھی دیکھی جا سکتی تھیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے شروع کے سالوں میں ترکی نے کئی اتار چڑھاؤ دیکھے۔ موجودہ ترکی کو اس زمانے کی بڑی طاقتوں سے بچانے کے لیے جدوجہد اور بے مثال شجاعت کی جو تاریخ رقم کی اس کی یادیں انقرہ میں کئی یادگاریں بنائی گئی ہیں۔

ایک پارک میں کمال اتا ترک اور ان کے قریبی ساتھیوں کے مجسموں والی ایک بڑی یادگار بنائی گئی ہے۔ میں نے چاہا کہ میری اس یادگار کے سامنے تصویر بن جائے۔ ترک چونکہ عام طور پر انگریزی نہیں جانتے، میں جس سے کہتا کہ وہ میرے کیمرے سے یادگار کے سامنے میری تصویر کھینچ دے، مگر وہ نہ میں سر ہلاتے ہوئے چلا جاتا۔ وہ غالباً یہ سمجھتا تھا کہ میں کوئی پروفیشنل فوٹو گرافر ہوں اور اس کی تصویر بنانے کی پیشکش کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک ترک میری بات سمجھ سکا، جس نے یادگار کے سامنے میری تصویر بنائی۔

انقرہ میں تاریخی عمارات کے ساتھ بہت اچھے عجائب گھر ہیں۔ ان عجائب گھروں میں ترکی اور بطور خاص اناطولیہ کی ثقافت اور تہذیب کو بڑے موثر طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ ان عجائب گھروں میں قدیم اور جدید تہذیبوں کے نوادرات اور سکے بہت اچھے طریقے سے رکھے گئے ہیں۔ مگر ان کو غور سے دیکھنے کے لیے کئی ہفتوں کا وقت چاہیے جو میرے پاس نہیں تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت میں ایک ریسٹورانٹ میں ترکی کا روایتی کھانے کے لیے گیا۔ میری میز کے نزدیک ایک میز پر چار نوجوان بھی کھانا کھا رہے تھے۔ جب میں نے بیرے کو کھانے کا آرڈر دیا تو یہ نوجوان سمجھ گئے کہ میں ایک اجنبی تھا۔ میرے نزدیک والی کرسی کے نوجوان نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس ملک سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے بتایا کہ میں پاکستانی ہوں۔ اس پر انھوں نے کہا کہ میں ان کی میز پر آ جاؤں۔ انھوں نے کہا کہ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کا مہمان بنوں اور ان کی طرف سے کھانا کھاؤں، مگر میں نے شکریہ کرتے ہوئے ان سے کہا کہ کھانے کے بعد میں ان کی میز پر آ جاؤں گا اور ہم اکٹھے کافی پئیں گے، چنانچہ کھانے کے بعد میں ان کی میز پر چلا گیا۔

ان میں سے دو نوجوان انجینئر تھے۔ ان میں سے ایک ازمیر میں ایک کمپنی میں ملازم تھا۔ باقی تینوں انقرہ میں رہتے تھے، چونکہ یہ تعلیم یافتہ لوگ تھے ان سے انگریزی میں بات چیت کی جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم بے تکلفی سے گپ شپ لگا رہے تھے۔ مثلاً ایک نوجوان نے مجھے بتایا کہ شہر میں تفریح کی کون کون سی جگہیں تھیں۔ ایک نے بتایا کہ سب سے زیادہ خوبصورت عورتیں برصہ میں ہوتی ہیں۔ برصہ لمبے عرصے تک ترکوں کا دارالحکومت رہ چکا تھا جہاں یورپ اور اناطولیہ کے لوگوں کی مخلوط نسلیں رہتی تھیں۔ ان کے کہنے پر ہم نزدیک ہی ایک مرکزی پارک میں چلے گئے۔ وہاں آدھی رات گئے تک چائے کے دور چلتے رہے اور سیاست، تاریخ، مذہب اور ہر قسم کے موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ اب

پھر وہ اڑ گئے کہ وہ بل ادا کریں گے۔ میں نے اپنی عمر کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے کہا کہ میں چونکہ آپ سے بڑا ہوں اس لیے مشرقی روایت کے مطابق بل مجھے ادا کرنا تھا۔ اس پر وہ لاجواب ہو گئے۔ ان نوجوانوں کے مشورے سے میں نے ترکی کی سیاحت اور اہم مقامات کا سفر کرنے کا پروگرام بنایا اور آیندہ میرا پروگرام ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق طے ہوا۔ رخصت ہوتے وقت ہم آپس میں قریبی رشتے داروں یا پرانے دستوں کی طرح گلے مل کر رخصت ہوئے۔

اگلے دن میں پاکستان کے سفارت خانے گیا۔ سفیر صاحب موجود نہیں تھے اس لیے کہ وہ پاکستان گئے ہوئے تھے۔ وہاں فرسٹ سیکرٹری صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوئی میں ان سے اپنے پرانے دوست حامد کمال آفندی اور ان کے چھوٹے بھائی ارکان ترکمان کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ دونوں کئی سال پہلے لاہور میں رہتے تھے اور نسلاً ترک تھے۔ لاہور میں یہ زیر تعلیم رہ چکے تھے ان دنوں میری ان سے دوستی ہوئی۔ بعد میں یہ ترکی چلے گئے۔ کچھ عرصہ تو ان کے ساتھ خط و کتابت رہی بعد میں ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ یہ دونوں بہت اچھی اردو اور پنجابی بھی بول سکتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ حامد کمال آفندی تو ازمیر میں کہیں رہتے تھے اور کبھی کبھی وہ پاکستانی سفارت خانے میں آتے رہتے ہیں۔ دوسرے بھائی ارکان ترکمان قونیہ میں سلجوق یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، ان کے فون نمبر مجھے سفارت خانے سے مل گئے۔

ہوٹل آ کر میں نے حامد کمال آفندی سے بات کرنے کی کوشش کی، مگر ان سے بات نہ ہو سکی، پھر میں نے ارکان سے قونیہ میں بات کی انھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور تاکید کی کہ جب میں قونیہ آؤں تو ان سے ضرور ملوں۔ وہ سلجوق یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کے مشترکہ ڈیپارٹمنٹ میں پڑھاتے تھے۔

انقرہ میں حتی عجائب گھر (Hitti Museum) قابل دید ہے۔ یہ اس عظیم الشان عمارت میں ہے جو محمد پاشا کے نام پر 1464ء میں بنائی گئی تھی۔ حتی تہذیب دنیا کی انتہائی قدیم تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ یہ رومن تہذیب سے پہلے کی تہذیب تھی۔ یہ غالباً اس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جب مصر میں فراعین ہوتے تھے۔ عجائب گھر میں حتی زمانے کے دھاتی سکے بھی محفوظ ہیں۔ ان میں سے کچھ سکوں پر بیل کی شبیہ بنی ہوئی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے کے یہ لوگ بھی سامری کے بچھڑے کی طرح یہاں بھی بچھڑے یا بیل کی پوجا کرتے تھے۔

انقرہ کی مساجد میں سب سے اہم وہ عظیم الشان مسجد جو حاجی بیرام جامعہ کے نام سے موسوم ہے۔

یہ 1429ء میں بنائی گئی تھی۔

انقرہ کے بازار میں گھومتے پھرتے مجھے کتابوں کی ایک دوکان میں شیشے کے پیچھے قرآن کریم کے نسخے نظر آئے۔ میں دکان کے اندر گیا تاکہ دیکھوں یہاں کسی قسم کی کتابیں ہیں اور اسلام سے متعلق اس سیکولر ملک میں کیا کام ہو رہا ہے۔ زیادہ تر کتابیں تو ترکی زبان میں تھی۔ ایک جگہ مجھے ترک ڈاکٹر ہلوک (Haluk) نور باقی کے لکھے گئے پانچ کتابچوں کے انگریزی ترجمے نظر آئے۔ سرسری طور پر دیکھنے سے یہ بہت اہم اور اچھوتے محسوس ہوئے۔ ہر کتابچے میں ڈاکٹر نور باقی نے قرآن کریم کی دس آیتوں کی تشریح موجودہ زمانے کے ثابت شدہ سائنسی حقائق کے تناظر میں کی ہے، چنانچہ میں نے پانچوں کتابچے خرید لیے اور ترکی کے سفر میں پڑھتا رہا۔ اس سے پہلے میں نے اس قسم کی تفسیر کہیں نہیں دیکھی تھی۔ بعد میں پاکستان آکر میں نے ان کا اردو ترجمہ کیا جو بے حد پسند کیا گیا۔ قرآنی آیات اور سائنسی حقائق کے نام سے اس کتاب کے پانچ ایڈیشن چھپ چکے ہیں، بلکہ اسے ہندوستان میں بھی کسی ناشر نے مجھ سے پیشگی اجازت کے بغیر چھاپ دیا ہے لاہور کے ایک کتب فروش ادارے نے اس کی فروخت کا اشتہار دیا تھا جس کے ذریعے مجھے معلوم ہوا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اللہ کے پیغام کے ابلاغ میں دیگر کچھ لوگ بھی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ مجھے اس وقت بہت خوشی ہوئی جب کراچی کے ایک سینئر قانون دان اور دانش ور راجا افتخار احمد صاحب نے میری ترجمہ شدہ کتاب پڑھ کر کہا کہ وہ پچھلے تیس سالوں سے لامذہب دہریہ تھے، لیکن اس کتاب کے مطالعہ اور قرآنی آیات پر غور کرنے کے بعد وہ پھر سے اسلام کی طرف پلٹ آئے۔

ترکی میں اسلامی تعلیمات کا پرجوش طریقے سے احیا ہو رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب 1951ء کے انتخاب میں ترکی ڈیموکریٹک پارٹی جیت گئی تو پہلی دفعہ حکومت کی طرف سے ادارہ الٰہیات (Ilahiyat Faculesi) قائم کیا گیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکی علما جو قدیم اسلامی علوم پر دسترس رکھتے ہیں ان کو جدید مغربی علوم سے بھی روشناس کرایا جائے۔ اس کے علاوہ اس ادارے کے توسط سے مساجد کے امام اور نئے علما بھی تیار کیے جائیں جو ان سکولوں اور کالجوں میں اسلامی علوم کی تدریس نئے زمانے کے حالات کے مطابق شروع کریں۔ اس سے قدیم مدرسے ختم ہو گئے۔

ایک لمبے عرصے تک ترکی میں دینی تعلیمات پر حکومتی سطح پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا تھا، لیکن کچھ عرصہ بعد ایسے مرد اور خواتین کی شدید ضرورت محسوس کی گئی جو مغربی علوم کے ساتھ قرآن اور حدیث کا علم

بھی رکھتے ہوں اور بنیادی اسلامی قوانین کے متعلق بھی معلومات رکھتے ہوں۔ اب ادارہ الھیات اس معاملے میں بہترین خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

مولانا رومؒ اور علامہ اقبالؒ کی روحانی مرید جرمن سکالر ڈاکٹر این میری شمل (Dr. Annemarie Schimmel) نے ادیان کی تاریخ پر دوسری ڈاکٹریٹ (PHD) کرنے کے بعد 1954ء میں ادارہ الہیات انقرہ بطور پروفیسر خدمات سرانجام دی تھیں۔ مجھے 1990ء کی دہائی میں کراچی میں ڈاکٹر شمل سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا اوران کے پبلک لیکچروں میں ان کے اچھوتے خیالات سے مستفیض ہوا تھا۔ ڈاکٹر شمل کو ترکی سے عشق کی حد تک پیار تھا۔ ترکی میں ان کو شروع ہی سے ایک اسلام دوست شخصیت کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ ڈاکٹر شمل کے مولانا رومؒ سے روحانی تعلق کا ذکر آئے گا۔

جب میں انقرہ میں پاکستانی سفارت خانہ میں گیا تھا تو شروع میں قائداعظمؒ کی تصویر لگی ہوئی تھی جس میں قائد نے قراقلی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ تصویر دیکھ کر مجھے بھی خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی انقرہ میں جناح کیپ پہن کر گھوموں پھروں۔ اس قسم کی ٹوپی پاکستان اور ترکی کے درمیان مشترکہ تہذیبی ورثہ کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن آج کل ترکی میں ایسی ٹوپی کوئی نہیں پہنتا اور اسے ایک دقیانوسی چیز سمجھا جاتا ہے۔ ایک وقت تو پرانے قسم کے لباس اور اس قسم کی ٹوپی کا استعمال قانونی طور پر منع تھا۔

دوسرے دن میں قراقلی ٹوپی پہن کر نکلا۔ میں نے محسوس کیا کہ پورے انقرہ شہر میں میں ہی اکیلا شخص تھا، جس نے یہ ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ کسی اور نے ایسی یا اس سے ملتی جلتی قراقلی ٹوپی نہیں پہنی ہوئی تھی اور ترک مجھے کس قدر حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ اس صورت حال سے میں دل ہی دل میں محظوظ ہو رہا تھا۔

انقرہ کی مرکزی سڑک پر چلتے چلتے میں نے پاکستان میں اپنے گھر والوں کو بھیجنے کے لیے پکچر پوسٹ کارڈ خریدے۔ وہاں میں نے ایک پارک میں ایک بینچ پر بیٹھ کر کارڈوں پر اڈریس لکھا اور چند لائنیں اردو میں لکھیں۔ اس کے بعد میں پوسٹ آفس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

مجھے نزدیک کوئی پوسٹ آفس نہ ملا۔ میں نے ایک دو راہگیروں سے پوسٹ آفس کا پتا پوچھا، لیکن زبان کی اجنبیت کی وجہ سے وہ راستہ نہ بتا سکے۔ اس دوران مجھے محسوس ہوا کہ میرا پیچھا کیا جارہا تھا۔ میں جس طرف جاتا میرے پیچھے دو ترک نوجوان بھی اس طرف چل پڑتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی سرکاری

خفیہ ایجنسی کے لوگ ہیں جو مجھ سے اجنبی شخص جس نے قراقلی ٹوپی پہن رکھی تھی کے متعلق کچھ معلومات اکٹھی کرنا چاہ رہے ہوں گے۔

ایک جگہ میں اچانک رک گیا اور ان کے نزدیک جا کر میں نے ان سے پوسٹ آفس کا پتا پوچھا۔ وہ دونوں کچھ چونک سے گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ انگریزی سمجھ سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ایک طرف اشارہ کیا اور میرے ساتھ چل کر پوسٹ آفس تک گئے۔ انھوں نے کارڈ پر انگریزی میں لکھے ایڈریس پر پاکستان پڑھ کر مجھ سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

کارڈ پوسٹ کرنے کے بعد مجھے دور سے ایک بہت بڑی شان دار مسجد نظر آئی جو ایک اونچی جگہ پر بنائی گئی تھی۔ اس کی بناوٹ اس قسم کی تھی جو استنبول میں مسجد سلیمانیہ یا نیلی (Blue) مسجد احمد کی ہے۔ یہ مسجد غالباً انقرہ کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ میں اس کو دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنے کو نزدیک نظر آ رہی تھی، لیکن حقیقت میں اچھی خاصی دور تھی اور میں تقریباً آدھا گھنٹہ پیدل چل کر وہاں پہنچا اور دو نوافل ادا کیے۔ اتنے میں اذان کا وقت بھی ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ باہر سے ایک جوان شخص ماڈرن ڈریس پہنے ہوئے آیا اور مسجد کے ہال کے بغلی کمرے میں چلا گیا۔ باہر نکلا تو اس نے ایک جبہ اور ترکی کے علما والی سرخ ٹوپی پر سفید پٹی والی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ترکی کی مساجد میں نماز کے امام عام طور پر باریش نہیں ہوتے، چنانچہ ان صاحب کی بھی داڑھی نہیں تھی۔ بہر حال انھوں نے نماز کی امامت کی اور واپس اس بغلی کمرے میں جا کر ماڈرن ڈریس پہن کر چل دیے۔

مسجد سے نکل کر میں پھر مرکزی سڑک پر مارکیٹ کی طرف آ گیا۔ راستے میں پینٹ کوٹ پہنے ایک نوجوان میرے پاس آیا اور مجھے السلام علیکم کہا۔ ساتھ ہی اس نے اردو میں پوچھا کہ کیا میں پاکستان سے آیا ہوں۔ میں نے کہا ہاں آپ کہاں سے آئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ بھی پاکستان سے آئے ہوئے ہیں اور میری قراقلی ٹوپی انھیں میری طرف کھینچ لائی تھی۔

میں نے اس نوجوان سے پوچھا کہ وہ کس سلسلے میں ترکی میں آیا تھا، مگر وہ مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ میں نے محسوس کیا وہ مجھے اپنا رازدان نہیں بنانا چاہتا تھا۔ دراصل پاکستان کے معاشی اور روزگار کے حالات اچھے نہ تھے۔ اس لیے بہت سے نوجوان روزگار اور ایک اچھے مستقبل کی تلاش میں یورپ پہنچ جانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ غریب والدین کی جمع پونجی اور زیورات بیچ کر ترکی کے راستے سفر پر نکل پڑتے ہیں، چونکہ انہیں قانون اور قاعدے کے مطابق یورپی

ممالک کے ویزے نہیں ملتے تو وہ انسانی سمگلروں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور اکثر و بیشتر وہ ایجنٹوں کے فراڈ کا شکار بن کر غیر ملکی جیلوں میں قید ہو جاتے ہیں یا پھر خالی ہاتھ پاکستان واپس آ جاتے ہیں۔ کچھ بدقسمت تو زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

پاکستان کے باہر ایسے بے سروسامان نوجوانوں کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے اور شدت سے احساس ہوتا ہے کہ پاکستانی حکومتیں چاہے وہ فوجی ہوں یا نام نہاد جمہوری ایسی عوام دوست پالیسیاں نہیں اپناتیں جن سے ملک میں روزگار کے بہتر مواقع میسر آ سکیں۔ اہل اقتدار صرف اپنے لیے دولت کے انبار اکٹھے کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

پاکستان کا آئین اور انتظامی ڈھانچہ چونکہ غلامی کے دور کے نوآبادیاتی نظام کی بنیاد پر بنایا گیا ہے اس لیے موجودہ نظام میں عوام دوست جمہوری نظام کبھی قائم نہیں ہو سکتا اور ہر دفعہ جمہوریت (ڈیمو کریسی) کی ضد ''امیر شاہی'' (Plutoctacy) کے تحت کرپٹ لوگ ہی اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ پلوٹو کریسی کے لغوی معنی ہیں ''دھن راج''، ''قارونیت'' اس نظام میں چاہے سیکڑوں انتخابات بھی ہو جائیں پاکستان میں عوام دوست حکومت کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ دیکھا گیا ہے کہ ہر غیر جمہوری نظام جیسے پلوٹو کریسی، ارسٹو کریسی (چند فیوڈلز کی حکومت) یا فسطائیت (فاشزم) وغیرہ بھی ووٹ ہی کے ذریعے قائم ہوتا ہے، جس سے عوام کا استحصال ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستانی میڈیا بھی عوام کو گمراہ کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا اور غیر جمہوری سیاسی نظام کو جمہوریت کے طور پر پیش کر کے سادے عوام کو جھوٹی تسلی کی تھپکی لگا کر بے حسی کی نیند میں سلائے رکھتا ہے، پھر پاکستانی دانش ور بھی زہر ہلال کو قند سمجھتے ہوئے عوامی شعور کو بیدار کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس طرح پاکستان میں فلاحی ریاست کے قیام کی طرف پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا جاسکا۔

قونیہ

انقرہ سے جنوب کی طرف تقریباً چار گھنٹے کی بس کی مسافت طے کر کے میں قونیا پہنچا۔ یہ مولانا جلال الدین رومیؒ کا شہر ہے۔ جیسے جیسے یہ شہر قریب آ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی اور مولانا کے مزار اور مقبرے کی زیارت کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر این میری شمل کو مولانا رومؒ کے کلام سے عشق کی حد تک پیار تھا۔ انھوں نے ان کے کلام کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ جرمنی سے آ کر استنبول میں ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہی تھیں۔ یہ ان کی نوجوانی کے دن تھے، انھوں نے اپنے جرمن دوستوں سے مولانا رومؒ کے مزار کی زیارت کے لیے قونیہ جانے کے لیے ساتھ دینے کی درخواست کی۔ انھوں نے پر جوش طریقے سے حامی بھری، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ فی الوقت وہ کچھ اہم مصروفیات کی بنا پر قونیہ نہیں جا سکتے، پھر شمل صاحبہ نے اپنے ترک دوستوں سے قونیہ تک ساتھ دینے کی درخواست کی۔ انھوں نے بھی حامی تو بھری، لیکن استنبول میں اپنی مصروفیات بیان کرتے ہوئے اس وقت قونیہ جانے سے معذرت کی۔ مایوس ہو کر ڈاکٹر شمل نے اپنی ترک خاتون دوست سے شکایتاً ذکر کیا کہ کس طرح ان کے دوستوں نے قونیہ تک ان کا ساتھ دینے سے معذرت کر لی تھی۔ ان کی ترک دوست نے ڈاکٹر شمل کو تسلی دیتے ہوئے کہا ”میری جان! وجہ صاف ظاہر ہے۔ حضرت مولاناؒ ان انکار کرنے والے لوگوں سے نہیں ملنا چاہتے وہ صرف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

اس کے بعد ڈاکٹر شمل اکیلے ہی استنبول سے قونیہ گئیں۔ اس کے بعد بھی وہ بار بار مولانا کے مزار پر حاضری دیتی رہیں۔ ڈاکٹر شمل پورے عالم اسلام میں صوفی بزرگوں کے کلام اور ان کے مزارات

پر حاضری دینے میں خاص دلچسپی رکھتی تھیں۔ وہ پاکستان میں بھی تمام قابل ذکر اہم مزارات پر گئیں۔ انھوں نے بطور خاص سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کے مطالعہ اور ترجمہ کرنے کے لیے سندھی زبان صرف چھ ماہ میں سیکھ لی اور جگہوں کے علاوہ بطور خاص ملتان بھی گئیں، جسے انھوں نے ''میرا پیارا شہر'' (My beloved City) کہا ہے اس لیے کہ ملتان کو اولیا اللہ بزرگوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ وہ ٹھٹھہ (سندھ) کے نزدیک مکلی کے مشہور اور قدیم قبرستان میں بطور خاص جایا کرتی تھیں جہاں قبروں پر پیلے رنگ سے ریتلے پتھروں پر کندہ عالی شان کاریگری سے بیل بوٹے اور جالیاں بنائی گئی ہیں۔ وہاں انھوں نے قدیم شاہی قبرستان میں شاہی خواتین کے لیے مخصوص حصے میں اپنے لیے بھی قبر کی جگہ رکھوائی تھی۔ ڈاکٹر شمل نے اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن ان کا انتقال جرمنی میں ہوا ان کے لواحقین کو یا تو ڈاکٹر شمل کا مکلی میں دفن ہونے کی خواہش کا علم نہیں تھا یا پھر انھوں نے ویسے ہی مرحوم کی خواہش کو اہمیت نہ دی اس طرح وہ اپنی پسند کی جگہ پر دفن نہ ہوسکیں۔

قونیہ کا نام کس طرح پڑا یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے، جب سلجوق ترکوں نے بازنطینی عیسائی سپاہ کو 1071ء میں شکست دی تو انھوں نے اناطولیہ میں قونیہ کو اپنا مرکز بنایا۔ اس زمانے میں یہ ایک پھولتا پھلتا شہر تھا، جہاں بڑے بڑے عالم اور فنون لطیفہ کے ماہر لوگ جمع ہو گئے تھے۔ جب منگولوں نے 1220ء کے بعد اسلامی دنیا کے مشرقی علاقوں کو تہس نہس کرنا شروع کیا تو مشرقی ایران اور خراسان کے رہنے والے برگزیدہ نیک لوگوں کو مجبوراً اپنے پرانے وطن کو چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی۔ ان میں سے دو بزرگ شخصیات بھی ایران سے اناطولیہ کی طرف ہجرت کر کے آئے۔ انھوں نے قونیہ کے سرسبز میدان دیکھے۔ ایک بزرگ نے دوسرے سے پوچھا ''قونالم نو'' (کیا یہاں رہ جائیں) دوسرے بزرگ نے جواباً کہاں: قونیہ (یہاں ٹھہرو) اس طرح اس اہم شہر کا نام پڑا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ بھی شروع جوانی میں اپنے والد حضرت بہاؤ الدین جو ایک مشہور عالم دین تھے، کے ساتھ اناطولیہ آئے۔ ان کے خاندان 1228ء تک لارندا کرمان میں رکا بعد میں ان کو قونیہ بلالیا گیا۔ ان کا نسب حضرت ابوبکرؓ سے جا ملتا ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے والد 1231ء میں وفات پا گئے۔ ان کے حلقہ ارادت میں امام فخر الدین رازی اور محمد خوارزم بھی تھے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قونیہ کے متعدد

مدرسوں میں درس وتدریس کا کام شروع کر دیا۔

جب جلال الدینؒ چھ سال کی عمر کے تھے تو ان کے والد بزرگوار کی ملاقات خواجہ فرید الدین عطارؒ سے ہوئی۔ انھوں نے مولانا رومؒ کو دیکھ کر ان کے والد سے تاکید کی کہ وہ اپنے بیٹے کی تعلیم اور تربیت کا خاص خیال رکھیں اور ان کو دینی علوم سے بطور خاص بہرور فرمائیں۔ شروع جوانی سے مولانا جلال الدین رومیؒ کا دل ہر وقت امت مسلمہ کی زبوں حالی میں ڈوبا رہتا تھا۔ ان کی جوانی کا دور غارت گری کا تھا۔ جب وہ گیارہ برسوں کے تھے تو اس وقت تاتاریوں کا فتنہ شروع ہو گیا تھا۔ آپؒ کے دور میں تقریباً نوے لاکھ انسانوں کا قتل عام ہوا۔

مولانا رومؒ کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں گوہر خاتون سے ہوئی جو سمرقند کے ایک بااثر شخص کی بیٹی تھیں۔ ان کے بطن سے آپؒ کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔

اخلاق کی جیت

قونیہ کی ایک اہم تاریخی اہمیت یہ بھی ہے کہ جب مغربی طاقتوں نے مسلمانوں کے خلاف بارھویں صدی عیسوی میں دوسری صلیبی جنگ شروع کی۔ جب یہ فوجیں قونیہ کے نزدیکی علاقے میں پہنچی تو انھیں ترکوں نے عبرت ناک شکست سے دوچار کردیا صلیبی افواج جن کے ساتھ فرانس کا بادشاہ بھی تھا، جان بچانے کے لیے مغرب میں افسس (Ephesus) اور جنوبی بندرگاہ اناطولیہ کے ذریعے جان بچانے کی کوشش کی۔ اس طرح یہ صلیبی جنگ بھی ختم ہوگئی۔

جن صلیبی فوجیوں کے پاس روپے پیسے تھے وہ تو کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا سکے۔ مگر ہزاروں کی تعداد میں صلیبی فوجی محصور ہوکر رہ گئے، ان کی حالت بے حد خراب تھی، مگر ترکوں نے ان پر ترس کھاتے ہوئے ہتھیار ڈالنے والی فوج کو علاج معالجہ فراہم کیا اور کچھ پیسے بھی دئے۔ یہ صلیبی جنگ جو، ترکوں کے انسان دوستی کے اس غیر معمولی حسنِ سلوک سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کرلیا۔ اس پر مشہور مغربی دانش ور ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے 1935ء میں اپنی کتاب Preaching of Islam میں اس زمانے کے ایک وقائع نگار کی یہ تحریر شائع کی۔

"They went in safety among the infidels (Turks) who had compassion on them .... More than three thousands joined themselves to the turks. Oh kindness more cruel than the treachery, They gave them bread but robbed them of their faith.... (odo of Deuil, De ludovico VIII)

عیسائی وقائع نگار کو یہ شکایت تھی کہ ترک مسلمانوں کی انسانی ہمدردی نے صلیبی سپاہیوں سے

ان کا مذہب چھین لیا۔ اس طرح انسانی ہمدردی زیادہ ظالم ثابت ہوئی، جس نے روٹی کے بدلے ان کے ایمان کو لوٹ لیا۔"

مگر عیسائی وقائع نگار کو یہ معلوم نہیں تھا کہ

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا

وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ صلیبیوں نے فتح کے بعد کسی مسلمان پر ترس نہیں کھایا تھا۔

مولانا کے قرب میں

قونیہ پہنچتے پہنچتے دن ڈھلے کا وقت ہو گیا۔ بس سے اتر کر میں نے ٹیکسی لی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے مولانا کے مزار کے قریب کس ہوٹل پہنچا دے۔ اس نے مولانا کا نام سنتے ہی اثبات میں سر ہلایا اور میرا سامان اٹھا کر اپنی ٹیکسی میں رکھ دیا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے تسلی کے لیے پھر پوچھا ''مولانا؟'' میں نے ہاں کہا پھر اس نے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے بتایا پاکستان سے اس نے فوراً گرمجوشی سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا'' کاردیش'' یعنی برادر

بس اسٹینڈ کے نزدیک دو تین بڑے بڑے جدید طرز کے ہوٹل بنے ہوئے تھے، جن میں عام طور پر جرمن، امریکی اور دیگر مغربی ممالک کے سیاح رہتے ہیں۔ ان سیاحوں کا مقصد بھی مولانا رومؒ کے مزار کو دیکھنا ہوتا ہے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ مجھے تو مولاناؒ کے مزار کے قریب ترین کسی جگہ رہنا تھا۔ ڈرائیور میرا مطلب سمجھ گیا اور تھوڑی دیر میں ہم قونیہ شہر کے قدیمی علاقے سے گذرتے ہوئے ایک چھوٹے سے ہوٹل تک پہنچ گئے۔

ہوٹل کے اہلکاروں نے میرا پاسپورٹ دیکھتے ہی بڑی خوش دلی سے خوش آمدید کیا اور تیسری (غالباً آخری) منزل پر مجھے ایک کمرہ دے دیا۔ جب میں نے کمرے کی کھڑکی کھولی تو میرے سامنے مولاناؒ کے مقبرے کا فیروزی رنگ والا خوبصورت گنبد مغرب کے ڈھلتے سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں مزار کی زیارت کو پہنچا تو اس وقت زیارت نہیں ہو سکتی تھی اس لیے کہ مغرب کے قریب مزار کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔

دوسرے دن ناشتہ کے بعد میں مولاناؒ کے مزار پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں خاصی تعداد

میں زائرین پہلے سے پہنچ چکے تھے۔ان میں خاصی تعداد گورے یورپین اور امریکی سیاحوں کی تھی۔

مزار کے بڑے ہال میں جہاں مولاناؒ اور دیگر اکابرین کی قبریں ہیں ایک رسی اس طرح باندھی گئی تھی کہ راہداری کو قبروں والے حصے سے جدا کر دیا گیا تھا اور عام زائرین رسی کے دوسری طرف مولاناؒ کی قبر کی طرف منہ کر کے فاتحہ خوانی کرر ہے تھے۔تمام قبروں کے سرہانے پر پگڑی بنی ہوتی ہے۔

مزار کے ہال میں دیوار پر خوبصورت فریموں میں مولاناؒ کے کلام کے حصے شعروں اور رباعیوں کی صورت میں آویزاں کیا گیا ہے۔

فاتحہ خوانی کے بعد میں خوبصورت نستعلیق خطاطی میں لکھی گئی ایک رباعی کے سامنے رُک گیا اور پڑھنے لگا، اگرچہ میری فارسی بہت اچھی نہیں، لیکن چونکہ ایف اے تک کالج میں فارسی پڑھی تھی اس لیے مولاناؒ کے کلام کی روح میری سمجھ میں آ گئی۔بس پھر کیا تھا بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا سکوں۔سوچ رہا تھا کہ باقی زائرین اور بطور خاص گورے عیسائی کیا سوچتے ہوں گے کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

میں اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے اس کمرے میں چلا گیا جہاں مولانا رومؒ سے متعلق اشیا اور نوادرات رکھے گئے ہیں، مگر وہاں بھی کافی زائرین تھے۔وہاں دو نوجوان ترک جنھوں نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے، میرے پاس آئے۔ان میں سے ایک نے پوچھا ''مملکت؟'' یعنی میں کہاں سے آیا ہوں۔میں جواب میں صرف ''پاکستان'' کہہ سکا۔انھوں نے گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملائے اور اصرار کیا کہ میں ان کا مہمان بن کر ان سے ساتھ کھانا کھاؤں۔میں نے معذرت کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا، مگر وہ بار بار اصرار کرتے رہے کہ میں ان کے ساتھ کھانا ضرور کھاؤں۔لیکن میں مزید کچھ وقت مزار کے نزدیک گذارنا چاہتا تھا اور مولانا سے متعلق رکھی اشیا کو بھی غور سے دیکھنا چاہتا تھا، پھر ابھی کچھ اور جگہوں کی زیارت بھی مجھے کرنا تھی۔اس لیے میں بڑی مشکل سے ان نوجوانوں سے اجازت لے کر الگ ہوا، مگر ان کی محبت اور خلوص میرے لیے سرمایہ حیات ہے۔میں ان سے بغل گیر ہو کر ان سے رخصت ہوا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے روضہ کے قریب ہی شاہ شمس تبریزؒ کا مزار بھی ہے یہ مولاناؒ کے قریبی دوست اور روحانی استاد بھی تھے۔

روایت کے مطابق ایک روز شاہ شمس تبریز بعد نماز عشا قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے سو گئے۔انھوں نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا جوان کے سرہانے کھڑے تھے اور فرمار ہے تھے'' بیٹے تم

اب ظاہری و باطنی علوم سے سرفراز ہو چکے ہو۔ اللہ نے تمھیں ایک اہم کام پر لگانا ہے، جس کے لیے تمھیں روم جانا ہوگا، وہاں محمد جلال الدین رومیؒ ہیں، جن کو تمہاری رہنمائی کی ضرورت ہے۔''

حضرت شاہ شمس تبریز جب نیند سے بیدار ہوئے تو انھوں نے اپنے مرشد حضرت بابا کمال الدین جندیؒ کو اپنا خواب سنایا۔ وہ خاموش رہے۔ حضرت تبریزیؒ کو دو اور موقعوں پر بھی یہی خواب آیا جو انھوں نے اپنے مرشد کو سنایا۔ آخری خواب کے بعد حضرت بابا کمال الدین جندیؒ نے انھیں روم جانے کی اجازت دے دی۔

شاہ شمس تبریزؒ مولانا رومؒ کی تلاش میں قونیہ پہنچے۔ جس سرائے میں انھوں نے قیام کیا اس کے ایک ملازم نے انھیں بتایا کہ مولانا جلال الدین رومیؒ ایک باغ میں ایک چبوترے پر منعقد ہونے والی ایک مجلس میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت تبریزیؒ وہاں پہنچے۔ اس وقت مولانا رومیؒ وہاں موجود نہیں تھے۔ وہاں موجود دیگر علما نے شاہ شمس تبریزیؒ سے علم القرآن سے سوالات کرنے شروع کر دئے۔

شاہ شمس تبریزیؒ نے اپنے اظہار خیال میں فرمایا کہ مسلمانوں کے زوال کی وجہ یہ ہے کہ وہ علم القرآن کو بھلا کر دولت دنیا اور عیش کوشی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

حضرت تبریزیؒ کی گفتگو کے دوران مولانا رومؒ بھی آ گئے۔ انھوں نے بھی شاہ شمس تبریزؒ کی تقریر سنی اور ان کے علم و فضل کی بہت تعریف کی۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ وہ قونیہ میں کس مقصد سے آئے تھے۔ آپؒ نے فرمایا میں صرف تم سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ اس کے لیے بعد چھ ماہ تک دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کافی دیر تک ملتے رہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کے دل میں حضرت شمس تبریزؒ کی جو قدر و منزل قائم ہو گئی تھی اس کا اندازہ بعد کے واقعات سے ہوا۔

مولانا رومؒ کی غزلیات نے شاہ شمسؒ کو حیات جاوداں عطا کی۔ ایک غزل کے مقطع میں انھوں نے انتہائی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا۔

شمس تبریز بما راہ حقیقت نمود ماز فیض قداوست کہ ایماں داریم

یعنی شمس تبریزؒ نے ہم کو حقیقت کی راہ دکھائی ہے، ہم اس کے فیض سے باایمان ہیں۔

درحقیقت شاہ شمسؒ سے ملنے کے بعد مولانا رومؒ کی زندگی بدل گئی۔ حضرت تبریزؒ نے انھیں عشق کی آگ میں جھونک دیا جہاں مولانا رومؒ پر بے شمار راز افشا ہوئے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ وہ عشق کی آگ میں راکھ ہو گئے، لیکن روحانیت کی آگ میں پختہ ہو گئے۔ دونوں نے مل کر لمبے عرصے کے لیے

نچلے کاٹے اور سلوک کی منزل تک پہنچے۔

مقامات سلوک کے تناظر میں مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ فنا کی حقیقت یہ ہے کہ سالک اپنی ہستی کو بالکل مٹا دے اور ذات الٰہی میں فنا ہو جائے۔ یہی مقام ہے جس میں منصور نے انا الحق کہا اور حضرت بایزید بسطامی نے کہا تھا اس حالت میں ایسا کہنا الزام نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

زوا باشد انا الحق از درختے چرانبودِ روا، ازنیک بختے

یعنی جب ایک درخت سے انا الحق کہنا جائز ہے تو پھر ایک نیک بخت سے کہنا کیوں جائز نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ نے درخت پر جو روشنی دیکھی تھی وہ خدا نہ تھی، لیکن اس سے آواز آئی میں تیرا خدا ہوں۔ جب ایک درخت کو خدائی کا دعویٰ اس بنا پر جائز ہے کہ وہ خدا کے نور سے منور ہو گیا تو انسان جو قدرت الٰہی کا سب سے بڑا مظہر ہے، ایک خاص مقام پر پہنچ کر کیوں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔

پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل کے بقول مولانا جلال الدین رومیؒ نے ایک جگہ منصور حلاج کو شاخ پر لگے ہوئے سرخ پھول سے تشبیہ دی ہے۔ رومیؒ کی مشہور مثنوی اور دیوان اس شہید عشق سے متعلق تلمیحات سے پر ہیں۔

مولانا رومؒ کو مالِ دنیا سے کوئی رغبت نہ تھی۔ لوگ روپیہ اشرفی لا کر مولانا کے نمدے کے نیچے رکھ دیتے تھے۔ مولانا ان کی خاطر قبول کر لیتے اور خاموش رہتے جب رات کو نماز کے لیے اٹھتے تو سب جمع کر کے کنوئیں میں ڈال دیتے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ دوستوں کو کیوں نہیں بخش دیتے۔ فرمایا کہ ''دوستی یہ ہے کہ محبوب ترین چیز دوست کو دے۔ دنیا کا مال زہر قاتل ہے۔ جس چیز سے مجھے زحمت ہوتی ہے نہیں چاہتا کہ وہ تمھیں دے دوں۔''

ایک دوسری مثال یہ ہے کہ مولاناؒ نے ایک عقیدت مند سے پوچھا ''تمہاری گزر بسر کیسے ہوتی ہے۔''

عقیدت مند نے کہا: ''کچھ مل جائے تو شکر کرتا ہوں نہ ملے تو صبر''

مولاناؒ نے فرمایا ''ایسا تو بغداد کے کتے بھی کرتے ہیں۔''

عقیدت مند نے پوچھا: ''آپ کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے۔''؟

مولاناؒ نے فرمایا: ''مل جائے تو خیرات کرتے ہیں نہ ملے تو شکر کرتے ہیں۔''

ایک مجلس میں مولانا جلال الدین رومیؒ اس طرح کہتے ہیں۔

''اس دھوکے کے گھر (دنیا) میں تیرے لیے نیشاپور کے ایک برف فروش کا قصہ نقل کروں۔
ایک آدمی فقیر تھا۔ گرمی کے موسم میں اس نے تھوڑی سی برف رکھی ہوئی تھی اور کوئی خریدار نہ تھا۔
گرمی میں برف پگھل گئی اور وہ برف فروش دردناک دل سے سرد آہیں نکالتا اور کہتا تھا'' پیسے بھی نہ رہے اور برف بھی کسی نے نہ خریدی۔''

ایک جگہ مولاناؒ فرماتے ہیں۔

''زہد کیا ہے؟ برائی کا ترک دینا۔

عاشقی کیا ہے؟

اپنے وجود کا ترک کر دینا۔''

اس سلسلے میں مولاناؒ منصور حلاج کے نعرہ انا الحق کے متعلق اپنے شعر میں تشریح کرتے ہیں۔

بود ان الحق در لبِ منصور نور بود انا اللہ در لب فرعون زور

ایک دن مولانا رومؒ کا ایک معتقد تازہ انجیر لایا اور آپؒ کو کھانے کے لیے پیش کئے۔ مولاناؒ نے اس سے کہا'' انجیر اچھے ہیں، مگر ان میں ہڈی ہے۔'' اس شخص کو حیرت ہوئی کہ انجیر میں ہڈی کہاں سے آئی۔
پھر جا کر وہ مولانا کے لیے دوسرے دن انجیر لایا۔ مولاناؒ نے ایک انجیر نوش فرمایا اور کہا کہ اس میں ہڈی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے خادم شیخ محمد کو اشارہ کیا باقی انجیر حاضرین مجلس میں تقسیم کر دے۔ لوگوں کو اس معاملے میں حیرت اور تجسس تھا۔

جب وہ انجیر لانے والا شخص باہر نکلا تو لوگوں نے اس سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے کہا کہ'' میں اپنے دوست کے باغ میں گیا۔ وہ موجود نہیں تھا۔ میں نے انجیر توڑ لیے اور آ کر مولاناؒ کی خدمت میں پیش کئے۔ میرا ارادہ تھا کہ قیمت بعد میں دے دوں گا۔ جب مولانا نے وہ انجیر نہ کھائے تو میں دوبارہ گیا۔ وہ دوست مل گیا۔ اس سے معافی چاہی اور قیمت ادا کر کے دوسری دفعہ انجیر قیمت ادا کر کے لایا اور مولاناؒ کو پیش کئے جو انھوں نے تناول فرمایا۔

کسب حلال اور خرچ حلال میں بھی مولاناؒ نے ایک نازک فرق قائم کیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ محض لقمہ حلال اور کسب حلال پر نظر نہ کرنا چاہئے کیوں کہ آمد کی اصل خرچ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مال کس طرح خرچ ہوتا ہے۔ بہت لقمہ حلال ایسا ہے کہ اس سے کاہلی اور سستی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، جو لقمہ جان میں ذوق وشوق بڑھائے اس عالم کی رغبت پیدا کرے اور طریقہ انبیا و اولیا کی طرف مائل کرے تو

اسے حلال سمجھو۔ یہ مرد نستنی ہے گفتی نہیں ہے جس لقمہ سے اس کے برعکس حالت پیدا ہو وہ حرام محض ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ حلال میں بھی وہی حلال ہے، جس سے روحانی قوت حاصل ہو۔''

مولانا جس طرح اپنے مریدوں کو کسب حلال کی تاکید فرماتے تھے خود بھی اس پر سختی سے کاربند تھے۔ آپؒ کے والد سلطان العلما کی طرح آپ بھی تمام امور پر فتویٰ دینے کی خدمت پر مامور تھے اور اس خدمت کے لیے بیت المال سے آپ کے لیے کچھ وظیفہ مقرر تھا۔ مولانا اس امر کا نہایت اہتمام کرتے تھے کہ یہ وظیفہ ان کے لیے جائز رہے۔ وہ اپنے اصحاب سے ہمیشہ یہ تاکید کرتے رہتے تھے کہ ''میں کسی حال میں ہوں، اگر کوئی شخص کوئی فتویٰ لائے یا کچھ سوال کرنا چاہے تو اس کو روکو نہیں تا کہ مرسوم مدارس مجھ پر حلال ہو جائے اور میں نہیں چاہتا کہ اس خاندان سے فتویٰ منقطع ہو جائے۔'' چنانچہ آپ کے مریدین ہر وقت قلم دوات تیار رکھتے تھے اور مولانا حالت استغراق سماع میں بھی فتویٰ لکھ دیا کرتے تھے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کا خاصا عفو و درگزر تھا۔ ایک روز مولانا اپنے حجرے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک شخص نے آکر کہا میں محتاج ہوں۔ جب مولانا کو نہایت درجہ مستغرق دیکھا تو غالیچہ پاؤں کے نیچے سے نکال کر لے گیا۔ خواجہ فخر الدین مراغی نے دیکھ لیا اور اس کا پیچھا کیا۔ وہ شخص بازار میں غالیچہ فروخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انھوں نے اس شخص کی لعنت ملامت شروع کر دی اور اسے پکڑ کر مولاناؒ کی خدمت میں لے آئے۔

مولاناؒ نے غلیچہ چوری کرنے والے کے بارے میں فرمایا ''اس کی احتیاج بہت زیادہ ہوگی اس لیے اس نے ایسا کیا۔ اسے معزور سمجھو اور یہ غلیچہ اس سے خرید لو۔''

قونیہ میں مولاناؒ کے مزار پر مجھے پکی عمر کے لوگوں کے علاوہ نوجوان ترک بھی خاصی تعداد میں نظر آئے، حالاں کہ ان کو مولانا کا کلام پڑھنا اور سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو مولانا کا سارا کلام فارسی میں ہے دوسرا اب چونکہ ترکوں نے اپنا رسم الخط بھی رومن بنا رکھا ہے اس لیے ان کے لیے مولانا کے کلام اور نثری نگارشات کو سمجھنا تقریباً ناممکن ہے، لیکن اب چونکہ ترکی میں اسلام کا احیا ہو رہا ہے اس لیے ترک کچھ اور نہیں تو محض عقیدت کے طور پر مولانا کے مزار پر آتے ہیں اور سکون حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی زبان میں بھی مولانا رومؒ پر بڑے پیانے پر کام ہوا ہے اور بے شمار کتابیں اور مضامین نوجوان ترکوں کو مولاناؒ سے روشناس کرا رہے ہیں۔

پیرِ رومیؒ اور اقبالؒ

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کو مولانا جلال الدین رومیؒ سے دلی عقیدت تھی، بلکہ وہ مولانا رومؒ کو اپنا پیرو مرشد مانتے ہوئے اپنے آپ کو ان کا مرید کہتے تھے۔ علامہ اپنی عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

چو رومیؒ در حرم دادن آزاں من
از و اموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصر کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

علامہ اقبال نے بی اے کی طالب علمی کے زمانے میں ہی اپنے ساتھی سوامی تیرتھ کو مثنوی مولانا رومؒ کے خیالات کی باقاعدہ تعلیم دی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام خط میں لکھا۔

''خدا کی رحمت ہو اقبال پر کہ وہ تعلیم مولانا رومؒ کا اہتمام کر رہا ہے۔''

علامہ اقبالؒ نے مارچ 1935ء میں محمد حسین عرشی صاحب سے کہا۔

''مثنوی رومیؒ کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمی پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیے۔ شوق خود مرشد ہے۔ میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں، اگر کبھی پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومیؒ افسوس ہم ایسے زمانے میں پیدا ہوئے۔''

مولانا رومیؒ کے نزدیک جو عقیدہ اپنے آپ کو عقلی کہتا ہے اور ثبوت اور دلیل کے سوا مطمئن

نہیں ہوسکتا وہ بالکل ایسا ہی بیکار ہے، جیسے وہ مسلک جس کی جڑیں رسم ورواج کی پابندی میں جڑی ہوئی ہوں۔ اس کے نزدیک عارف اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ عقل ابلیس کی طرف سے ہے اور عشق آدم کی طرف سے۔

10 فروری 1938ء کے دن حکومت پنجاب کے سیکرٹری مسٹر ہیوم علامہ اقبالؒ سے ملنے آئے۔ ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

مسٹر ہیوم: ''غزالی کو پڑھ رہا ہوں۔ کسی صوفی بزرگ کا پتا دیجیے۔''

علامہؒ: ''یہ تو ذرا مشکل سی بات ہے۔ ہماری ساری عمر گزر گئی کوئی فرد کامل نہ ملا۔''

مسٹر ہیوم: پروفیسر میسے نون نے خود مجھ سے کہا، اگر میں حلاج کی تحریریں نہ پڑھتا تو دہریہ ہو جاتا۔

علامہ: (ہنستے ہوئے) ''ہمارا بھی شاید یہی حال ہوتا، لیکن ہماری دستگیری رومیؒ نے کی۔''

مولانا رومؒ کے بارے میں اپنے فارسی شعر میں علامہؒ اس طرح کہتے ہیں۔

نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش
جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

یعنی ''قرآن کا نور اس (رومیؒ) کے سینے میں موجود ہے۔ اس کے آئینے کے مقابل جامِ جم بھی بے مایہ ہے۔

علامہ اقبال کلامِ مولانا رومؒ کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

روئے خود بخود حق سرشت
کو بحرفِ پہلوی قرآں نوشت

یعنی۔ پیر حق (رومیؒ) کا روئے مبارک حق کے پیرایے میں ہے کہ انھوں نے قرآن کو فارسی میں لکھ دیا ہے۔

ایران کے مشہور دانشور عبدالحمید عرفانی کہتے ہیں۔

''رومی در تفہیم و تفسیر قرآن ہم آہنگ اقبال است۔''

یعنی قرآن کے فہم اور تفسیر میں رومیؒ اور اقبال ہم آہنگ ہیں (ایک سوچ رکھتے ہیں)

مولانا رومیؒ کے حلم و تواضع کی ایک شان دار مثال وہ ہے جب ایک عیسائی راہب مولانا کے



عثمانیہ سلطنت کے بانی غازی عثمان اول



غازی فخری پاشا



فخری پاشا مدینہ میں



اتاترک، خالدہ ادیب خانم (ترکی جون آف آرک) کے ساتھ



شبیہ مولانا رومؒ اور درویش



غازی کمال اتاترک گیلی پولی کے محاذ پر جوانوں کے ساتھ



توپ کاپی محل کا اندرونی منظر



قونیہ، مولانا روم کا مزار



کپادوکیا کی وادی



استنبول کے گالاتا پُل کا ایک منظر



انطالیہ



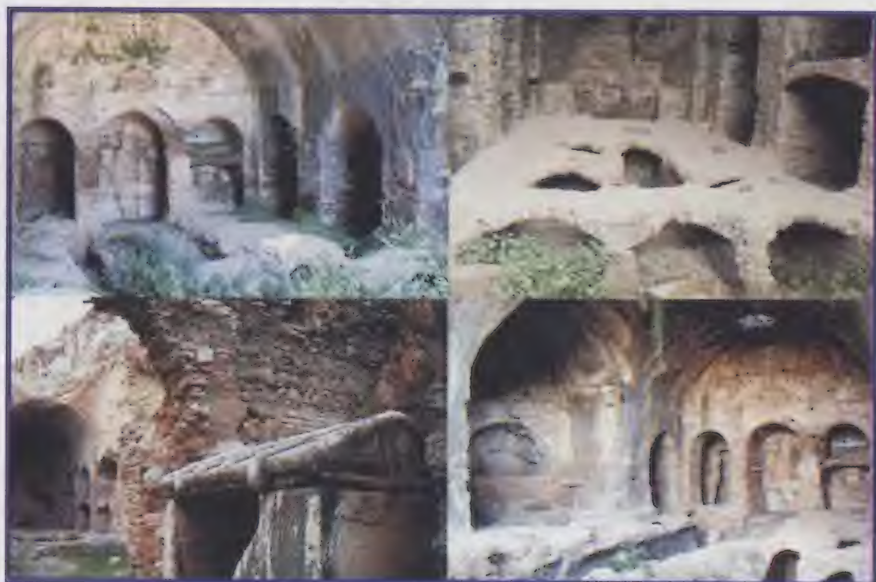
سلجوق قلعہ کا ایک منظر



تاریخی قلعہ سلجوق



مصنف ترک پروفیسر اور ڈاکٹر ارکان ترکمان کے ساتھ



افسس میں، اصحابِ کہف کی غار

مصنف گوریمے میں



انطالیہ میں مصنف یورپین اور امریکن سیاحوں کے ساتھ



مصنف انقرہ میں



تاکسیم اسکوائر استنبول



افسس کی لائبریری



استنبول کا باسفورس سے خوبصورت منظر



اناطولیہ کا ایک گاؤں



آیاءصوفیہ



استنبول کی مشہورِ زمانہ نیلی مسجد



تاکسیم میں استقلال روڈ

علم وحلم کا شہرہ سن کر قسطنطنیہ سے بہ غرض ملاقات آیا تھا۔

اتفاقاً راستہ میں ملاقات ہوگئی۔ اس نے پے در پے تیس بار مولانا کے آگے سر جھکایا اور جب سر اٹھایا تو دیکھا مولانا سر جھکائے ہوئے ہیں۔ اس نے پریشان ہوکر کہا کہ آخر تواضع کی کوئی حد بھی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ''جب ہمارے سلطان دو عالم کا فرمان ہے کہ ''طوبیٰ لمن تواضع'' تو میں کیوں تواضع نہ کروں۔''

وہ راہب مع اپنے رفقا کے مسلمان اور مرید ہوگیا۔ مدرسہ میں جب تشریف لائے تو فرمایا کہ ''آج ایک راہب چاہتا تھا کہ تواضع و مسکنت میں بازی لے جائے۔

الحمد اللہ کہ میں ہی غالب رہا۔''

مولانا رومؒ کے متعلق علامہ اقبالؒ کا حرفِ آخر اس طرح ہے۔

نہ اُٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے

وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

مغرب کے دانش وروں نے بھی مولانا رومؒ کے کمالات کے متعلق بہترین الفاظ میں تعریف کی ہے۔ ڈاکٹر اے آر نکلسن

"In Rumi the persona mystical genius found its, supreme expression .... Rumi in justly regarded a supreme master"

پروفیسر براؤن (E.G.Brown) کے مولانا رومؒ کے متعلق لکھا۔

"The most prominent sufi poet whom persian has produced."

پروفیسر آربری (Aj. Arberg) نے کہا:

"Jalaluddin Rumi has been recognized as the greater poet of Islam and it will be argued that he is the supreme mystical poet of all."

ڈاکٹر این میری شمل کے بقول مولانا روم کے کلام نے علامہ اقبالؒ کے منصور حلاج کے متعلق شروع کے خیالات کو تبدیل کر دیا، جس کا ثبوت علامہ کے فارسی کلام جاوید نامہ میں ملتا ہے۔

حلاج کے کلام سے چند نمونے حسب ذیل ہیں۔

''اے انسان تو اسے دیکھ نہیں سکتا، لیکن تیرے لیے بہتر ہے کہ اس کی طرف کان لگا اور اس کے کلمات پر غور کر۔ انھی کلمات کو سنو جو اس کی طرف سے گوش بر آواز پڑتے ہیں، یعنی تلاوت قرآن

پاک کرو اور اس پر غور کرو۔

پھر حلاج نے کہا۔

''اے رب لایزال تو ایک ایسی ہستی ہے، جس کے معنی و مطالب میں میرا تمام علم وفن محدود ہو گیا ہے اور اگر میں کسی شے کی بھی تمنا کروں تو میری کل تمنا تو ہی ہے۔''

ایک اور جگہ حلاج کا کہنا ہے:

''اے میرے قابل اعتماد ساتھیو! بہتر ہے مجھے قتل کر دو کیوں کہ میرا قتل ہی میری زندگی کا ضامن ہے۔ یاد رکھو میری موت میری حیات ہے اور میری حیات میری موت کے اندر مضمر ہے۔''

''میرے نزدیک انتہائی گراں قدر کارناموں میں سے سب سے بلند اور اونچا کارنامہ یہ ہے کہ میں اپنے وجود کو مٹا ڈالوں۔''

''میری ذات کا شہود میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اور قرب الٰہی نے مجھ سے میرا نام تک بھلا دیا ہے۔''

غالباً یہی وہ مقام ہو گا جب منصور نے اناالحق کا نعرہ لگایا اور پھانسی کی سزا پائی۔

میری بہت خواہش تھی کہ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار پر ہونے والے مشہور زمانہ درویشوں کا ذکر ور قص دیکھنے کا شوق پورا کروں، لیکن مجھے بتایا گیا کہ یہ اس مہینے میں نہیں ہونے والا تھا۔ اس لیے میری یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔

''ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے سلسلے کو جلالی قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی کہتے ہیں کہ چونکہ مولانا کا لقب جلال الدین تھا اس لیے ان سے انتساب کی وجہ سے یہ نام مشہور ہوا ہو گا، لیکن آج کل ایشیائے کوچک، شام، مصر اور قسطنطنیہ میں اس فرقہ کو مولویہ کہتے ہیں۔ میں نے سفر کے زمانے میں اس فرقے کے اکثر جلسے دیکھے ہیں۔ یہ لوگ نمدے کی ٹوپی پہنتے ہیں، جس میں جوڑ یا درز نہیں ہوتی۔ مشائخ اس ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں۔ خرقہ یا کرتے کے ساتھ ایک چنٹ دار پاجامہ ہوتا ہے۔ ذکر و شغل کا طریقہ یہ ہے کہ یہ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں۔ ایک شخص کھڑا ہو کر ایک ہاتھ سینے پر اور ایک ہاتھ پھیلائے ہوئے رقص کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اور درویش بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ رقص میں آگے یا پیچھے بڑھنا یا ہٹنا نہیں ہوتا، بلکہ ایک جگہ جم کر متصل چکر لگاتے ہیں۔ سماع کے وقت دف اور نے بھی بجائے جاتے ہیں اور جذب و مستی کا سماں بندھ جاتا ہے۔'' نے (بنسری) کو فرقہ مولویہ کے

درویش ایک مقدس ساز سمجھتے ہیں۔

درویشوں کا یہ رقص ابھی تک اسی طریقے سے جاری ہے، جیسا کہ یہ کئی سو سال پہلے تھا۔ یہ درویش رقص کی حالت میں وجد کی سی کیفیت میں نظر آتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ اپنے جذبات کو روحانی دنیا میں جذب کئے ہوئے ہیں۔ ان کا صوفیانہ رنگ ہوتا ہے۔ ایک صوفی کا مقصد دینا ہوتا ہے۔ دوسروں کی عزت کرنا اور اللہ سے بے لوث محبت ہوتا ہے۔

مولانا رومؒ کی آٹھ سویں یوم پیدائش پر بین الاقوامی ادارے یونیسکو نے سن 2007ء کو مولانا رومیؒ کا سال قرار دیا۔

اقبالیات کے مشہور سکالر ڈاکٹر طاہر حمید تنولی اپنی کتاب اقبالیت تفہیم کی جہات میں علامہ اقبال کے تصور عشق کے متعلق لکھتے ہیں۔

''اقبال کے تصور عشق کے مفاہیم کثیر الجہات ہیں، تاہم وہ بنیادی پہلو جو اقبال کے تصور عشق کو نمایاں کرتا ہے یہ ہے کہ یہ عقل کا وہ درجہ ہے جہاں انسان اندیشہ سود و زیاں سے بالاتر ہو کر میدان عمل میں اس طرح قدم رکھتا ہے کہ وہ نہ صرف ہر طرح کی تشکیک، التباس اور شبہات سے پاک ہوتا ہے بلکہ منزل مقصود بھی اس کا مقصد رہتی ہے۔ گویا اقبال کا تصور عشق جذباتیت سے عبارت نہیں ہے، بلکہ یہ تحقیق کے بعد اختیار کی جانے والی تصدیق کی وہ عملی صورت ہے، جس کا نتیجہ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ کی صورت میں ذات خداوندی کے رنگ کو اپنی ذات کا حصہ بنانے پر منتج ہوتا ہے۔''

علامہ اقبالؒ افسوس کے ساتھ کہتے ہیں۔

مسلم از سرِ نبیؐ بیگانہ شد باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد
از منات و لات و عزیٰ و ہبل ہر یکی دارد بتی اندر بغل
شیخ ما از برہمن کافرتر است راکہ اور اسومنات اندر سراست

یعنی مسلمان عشق نبیؐ سے بے گانہ ہوا اور اس وجہ سے بیت الحرم (یعنی دل) دوبارہ بت خانہ بن گیا۔

ہر مسلمان لات ومنات عربیٰ اور ہبل جیسے بتوں میں سے کوئی نہ کوئی بت اپنی بغل میں رکھے ہوئے ہے۔

ہمارا شیخ برہمن سے زیادہ کافر ہے، کیوں کہ اس کا سومنات اس کے اندر سرایت کر چکا ہے۔

اس کا علاج علامہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

عاشقی آموز و محبوبی طلب چشمِ نوحی قلب ایوبی طلب
کیمیا پیدا کن از مشت گلی بوسہ زن بر آستانِ کاملی

یعنی عاشقی سیکھ اور اپنے محبوب کو تلاش کر، مگر اس کے لیے نوحؑ کی آنکھ اور ایوبؑ کا دل چاہئے۔

کسی کامل انسان کے آستانے پر بوسہ دے اور اپنی مشت خاک کو کیمیا بنا لے۔ اپنی شمع کو رومیؒ کی مانند روشن کر اور روم کو تبریزؒ کی آگ میں جلا دے۔

حرفِ آخر کی طرح علامہ عشق کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

مولانا جلال الدین رومیؒ بھی کہتے ہیں کہ عشق بندے کو آزادی عطا کرتا ہے، چنانچہ اپنی مثنوی میں وہ کہتے ہیں۔

در شریعت مرگواہی بندہ را نیست قدری نزد دعویٰ و قضا

یعنی دعویٰ اور حکم نامے کے سلسلے میں شریعت کے قانون کے تحت ایک غلام کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔

اسی نظریہ کو اقبال وسیع تر اور زیادہ مربوط طریقے سے بیان کرتے ہیں۔

حلقہ شوق میں وہ جراتِ اندیشہ کہاں آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق

مولانا رومؒ دنیا میں جدوجہد اور کسب کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور دنیا سے قطع تعلقی کے خلاف تھے۔ وہ اکثر مسائل کو تمثیل سے سمجھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے فرمایا۔

''ایک درویش چالیس سال تک والہ و حیران جنگلوں میں پھرتا رہا۔ اتفاق سے ایک قطب کا وہاں سے گزر ہوا۔ انھوں نے درویش کو چپت لگا کر اسے حرام خور مرد کہہ کر مخاطب کیا۔ درویش نے کہا میں نے چالیس سال تک حلال کھانا بھی نہیں کھایا حرام کا کیا ذکر ہے۔ قطب نے کہا ''ہوا سے سانس لیتے رہے ہو اور خوشبو بھی سونگھتے رہے ہو کیا یہ تمہاری غذا نہ تھی۔ تمھیں یہ چیزیں رنج و کد کے بغیر حاصل ہوتی رہی ہیں۔ یہ مرد کامل کے مذہب میں حرام ہیں۔''

علامہ اقبال نے جو رومیؒ کو اپنا مرشد بنا کر جو اپنایا ہے تو اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ رومیؒ ہماری روایات کے امین ہیں۔ ان کا رشتہ دنیاوی یا مادی نہیں، بلکہ اسلام کی روحانی اخوت سے ہے۔ چونکہ فلسفہ اور سائنس کے میدان میں فرنگیوں نے بڑی ترقی کی ہے اور ان کا جادو مسلم امہ پر چل چکا ہے، اگر ہم فرنگی حکمت و دانش کے جال میں گرفتار ہو گئے تو ہم ہمیشہ غلام ہی رہیں گے۔ اب بھی آزاد ہونے کے باوجود ہم غیروں کی دانش کے غلام ہیں۔ مغربی اقوام نے ہمیں باور کرا دیا ہے کہ عقل کے مالک صرف وہی ہیں اور وہ ہم سے برتر ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے محسوس کر لیا تھا کہ اہل مغرب کے عقلی اور تہذیبی جادو کے طلسم کو صرف عشق کی ضرب کاری سے ہی توڑا جا سکتا ہے اور عشق کی یہ دولت اہل مغرب کے حکما کے پاس نہیں ہے، بلکہ یہ دولت رومیؒ کے گھر میں دستیاب ہے۔ اس لیے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

مولانا رومؒ نے بھی عقل کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک عقل کلی اور ایک عقل جزو۔ وہ کہتے ہیں۔

آں خطا دیدن ز ضعف عقل اوست
عقل کل مغز است و عقل جزاوست

مولانا روم سے محبت میں یہ راز بھی پنہاں ہے کہ مولانا دانش نورانی کے حامل ہیں۔ وہ ہمارے سب شاعروں سے الگ ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے تمام علوم پر حاوی ہونے کے باوجود اسلام کی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں پر بٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے ایک ایسے شخص کی ضرورت پر زور دیا ہے جو رومیؒ کی طرح نہ صرف جدید علوم سے واقف ہو بلکہ اسلام کی روشنی سے بھی منور ہو۔ اس لیے انھوں نے کہا

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

علامہ اپنے خطبات میں لکھتے ہیں۔ ''دراصل عصر کو ایک رومیؒ کی ضرورت ہے جو دلوں کی زندگی امید و ذوق کے جذبات سے معمور کر دے۔''

علامہ اقبال کے افکار و تصورات نے سب سے زیادہ اثر ترک قوم پر چھوڑا۔ ان کی شاعری

میں ترکوں کی خاص جگہ ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کا تعارف ترکی میں بنیادی طور پر علامہ اقبالؒ کی وجہ سے ہوا۔ ترکی میں اقبال شناسی کا پہلا قدم ترکی کے قومی شاعراور مفکراعظم محمد عاکف اور صوئے ہی نے اٹھایا جواستنبول میں 1873ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور درس تدریس سے منسلک ہو گئے۔ وہ محکمہ تعلیم میں ڈائریکٹر بن گئے۔ بعد میں 1908ء میں وہ استنبول یونیورسٹی میں شعبہ ادبیات میں پروفیسر بنے۔ جنگ آزادی کے دوران وہ گاؤں گاؤں پھرے اور ترکوں کی آزادی کے لیے بے بہا خدمات سرانجام دیں۔ 1920ء میں وہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

1921ء میں انھوں نے ترکی کا قومی ترانہ لکھا جسے ''ترانہ آزادی، کے نام سے ترک قوم نے قبول کرلیا۔ ترکی کی حکومت نے اسلامی جذبات سے پر ترانہ لکھنے پر انھیں معاوضہ دینے کی پیشکش کی، لیکن انھوں نے کچھ لینے سے انکار کر دیا۔

محمد عاکف نے جنگ نجات کے دوران ہی علامہ اقبال کا کچھ کلام انقرہ میں پڑھا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اقبال اپنے کلام میں وہی کہتے ہیں جو وہ خود کہنا چاہتے تھے۔ محمدؑ عاکف نے اپنے دوستوں، دانش وروں اور اپنے اقارب کو کلام اقبال پڑھنے کا مشورہ دیا۔ ان کی نظر میں اقبال عصر حاضر کے جلال الدین رومیؒ تھے۔ چنانچہ عاکف نے ترکی میں اقبال شناسی کی داغ بیل ڈالی۔

محمد عاکف کہا کرتے تھے کہ علامہ اقبال کا کلام پڑھ کر کئی جگہوں پر ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔

اس کے بعد ترکی میں اقبال شناسی کے سلسلے میں سب سے نمایاں کام پروفیسر ڈاکٹر علی نہاد تاران نے سرانجام دیا۔ وہ کہتے تھے ''پاکستان کے عظیم ملی شاعر اقبال کو ترکی کے روشن خیال طبقہ میں روشناس کرانا میری زندگی کے گنے چنے مظاہر میں سے ایک ہے۔''

انھوں نے اقبال کے فارسی کلام کی بڑی مقدار کو ترکی زبان میں ترجمہ کیا ان میں پیام مشرق، گلشن راز جدید اور ارمغان حجاز شامل ہیں۔ ان کی ترکی زبان میں نظم ''اقبال'' بہت مشہور ہوئی۔

اقبال کے ترکی میں تعارف کے سلسلے میں تیسرا نام عبدالقادر قرہ خان کا ہے جنھوں نے ''ترکی میں محمد اقبال'' کے عنوان سے ایک کتابچہ ترتیب دیا۔ انھوں نے علامہ اقبال پر دو قابل قدر کتابیں بھی لکھیں۔

ترکی میں اقبال شناسی کے محکمہ بنیادوں پر قائم ہونے میں پروفیسر ڈاکٹر علی گینجیلی نے بھی بے

حد اہم کام کیا۔ انھیں کلام اقبال سے والہانہ عشق تھا۔ وہ اقبال کو دنیا کے عظیم مفکروں اور شاعروں کی صف اول میں شمار کرتے تھے۔

معروف جرمن مشرق شناس ڈاکٹر این میری شمل نے 1958ء میں علامہ اقبال کے فارسی کلام ''جاوید نامہ'' کا ترکی میں ترجمہ کر کے علامہ کے کلام کو شرح کے ساتھ پیش کرنے کا پہلا اقدام اٹھایا۔

این میری شمل کے بعد حسین پرویز حاتمی نے بھی ''جاوید نامہ'' کا 1965ء میں ترجمہ کر کے استنبول سے چھپوایا تھا۔ اس کے بعد احمد متین شاہین نے ''جاوید نامہ'' کا منظوم ترجمہ کیا جو 1997ء میں برصہ سے شائع ہوا۔ شاعری کے علاوہ علامہ اقبال کے مشہور لیکچرز The Reconstrution of Religious Thought کے تراجم مختلف تاریخوں میں شائع ہوئے۔ اس سلسلے میں صوفی حوری اور ڈاکٹر احمد اسرار کے نام سرفہرست ہیں۔ ترکی کی یونیورسٹی میں علامہ اقبال پر لکھے گئے تھیسیوں میں اکثر حوالے ان کتابوں اور علامہ سے متعلق چھوٹی کتابوں اور رسالوں میں شائع مواد سے دیے گئے ہیں۔

بیسوی صدی کی آخری دہائی میں ترکی کے ماڈرن حلقوں میں اقبال کا تعارف کرانے میں ڈاکٹر یاشار نوری اوزترک کا بڑااہم کردار ہے۔

استنبول میں 1995ء میں شہر کی بلدیہ نے بین الاقوامی ''محمد اقبال کانفرنس'' منعقد کی۔ اس وقت استنبول کے میئر رجب طیب ایردوغان (بعد میں وزیر اعظم) نے تقریب کی تقاریر کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ میئر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا۔

''محمد اقبال نے ایک ایسے دور میں اپنی زندگی بسر کی، جس میں عالم اسلام بہت مشکلوں سے دوچار تھا۔ وہ اپنی ہستی اور نیستی کی جنگ لڑ رہا تھا وہ اس پرخطر دور کے روشن فکر اور بے نظیر شاعر ہیں۔ وہ مشرق اور مغرب کو ان کی گہرائیوں تک جاننے والے ایک علامہ اور مفکر ہیں...... ان کا دل و دماغ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام عالم اسلام اور تمام انسانیت کے لیے عشق سے پر تھا۔ انھوں نے جنگ ہائے بلقان، پہلی جنگ عظیم اور ہماری جنگ آزادی کے دوران اپنی شاعری، تصورات اور ہیجان سے ہمارا ساتھ دیا اور ہماری فتح اور کامیابی کی خاطر دعائیں مانگیں۔'' پھر انھوں نے کہا ''ہم پر اقبال کا ادھار ہے، اگر ہماری طرف سے منعقدہ ان کانفرنسوں میں اس ادھار کا چھوٹا سا حصہ ادا ہوسکا تو ہم اپنے آپ کو مسرور سمجھیں گے۔''

یاشار نوری اوزترک ایک ترک دانش ور، عالم دین اور سیاستدان ہیں۔ وہ لکھتے ہیں

''مشتر کہ رائے کے مطابق اقبال بیسویں صدی کے لیکن میرے خیال میں آخری سات صدیوں کے سب سے عظیم اسلامی مفکر ہیں۔ میں انھیں قرآنی مذہب کے وجدان کا آدمی کہتا ہوں۔ ان کے بقول اقبال کے سامنے ایک ہی دشمن اور بلاسد باب بنی ہوئی تھی، وہ قرآنی مذہب کو اپنی خواہشات، بے دماغیوں اور مفادات کا آلہ کار بناتے ہوئے بگاڑ کر دنیا کے سامنے ذلیل کرنے والے مذہبی کٹر رجعت پسند ہیں۔ یعنی اسلام اور مسلمانوں کی گیارہ صدی کی کالی بلا اور سیاہ بخت ہے۔''

ان کے مطابق اقبال کے خلاف اس کالی بلا کی طرح کٹر رجعت پسندوں کی طرف سے فتویٰ جاری ہوا اور انھیں کافر کہا گیا اوزترک کے بقول ''ان علتوں کا تشکیل دادہ دین خواہ اسلام کے نام سے مذکور ہو بھی وہ درحقیقت ''قرآنی مذہب نہیں ایک قسم کا ملاازم ہے۔''

محمد عاکف کے نزدیک ''رجعت پسند، ملا ٹائپ افراد کی طرف سے ''اسلام'' کے عنوان سے جعلی مذہب سب سے پہلے اسلام کے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر اسناد کئے ہوئے جھوٹوں پر بلند ہوا تھا۔''

اوزترک کے مطابق ''اگر اہل اسلام اقبال اور اتاترک کو سچ مچ پہچان سکتے تو آج مشرق وسطیٰ صلیبیوں کے قبضے میں آہ وزاری نہیں کرتا۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے روحانی مرید علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں مولانا سے جو عقیدت کا اظہار کیا ہے، اس نے ان کو اپنے مرشد کے بہت قریب کر دیا ہے۔ اس تعلق کا مادی طور پر اس طرح اظہار کیا گیا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے مزار سے مٹی لا کر مولانا رومؒ کے مزار کے احاطے میں ایک جگہ دفن کر دی گئی ہے اور اس کے اوپر ایک قبر یا کتبہ بنا دیا گیا ہے جو تصوراتی طور پر علامہ اقبالؒ کی قبر ہے۔

ایک دفعہ علامہ اقبالؒ کے صاحبزادے ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال نے قونیہ میں ایک ثقافتی کانفرنس میں اپنی تقریر میں کہا کہ سب کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ علامہ اقبالؒ پاکستان کے روحانی باپ ہیں اور اقبال یہ جانے خود حضرت رومیؒ سے بے حد متاثر تھے تو اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ پاکستان تو جنوبی ایشیا میں واقع ہے، لیکن اس کی روحانی اور ثقافتی جڑیں قونیہ میں ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کے ان جملوں نے ترکوں کو بے حد متاثر کیا اور تقاضا کر کے ان سے یہ جملے بار بار سنے گئے۔ وہاں کے اخباروں نے بھی ان جملوں کو نمایاں طور پر شائع کیا۔

اس کے بعد ایک اور کانفرنس انھی دنوں میں اناطولیہ کے شہر ایسکی شہر (Eskishehir) میں منعقد ہوئی ایسکی شہر کا مطلب پرانا شہر ہے۔ میں اس کے نزدیک

نوشہر (Nevshehr) اس وقت گیا تھا جب میں قریبی علاقہ گوریمے میں اوپن ائیر میوزیم دیکھنے گیا تھا۔

ایکسی شہر پر جنگ اول کے زمانے میں یونانیوں نے انگریزوں کی مدد سے قبضہ کرلیا تھا۔ اسی مقام پر کمال اتاترک نے انھیں شکست فاش دی تھی۔ ایکسی شہر کی مشہوری کی ایک اور وجہ ترکی کے ایک بڑے شاعر یونس امرے بھی ہیں۔ یہ مولانا رومؒ کے ہم عصر تھے۔ ان کا کلام بھی روحانی عشق اور انسانیت سے محبت کا کلام تھا، مگر ان کا کلام ترکی زبان میں تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال جنھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی اپنے تاثرات میں اور چیزوں کے علاوہ کہتے ہیں کہ سرکاری طور پر سیکولرازم کے فروغ کے برعکس وہاں سب خواتین مغربی لباس میں نہیں تھیں، بلکہ وہ روایتی ترکی لباس میں تھیں۔ وہاں مردوں سے زیادہ خواتین نماز ادا کر رہی تھیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے مقالے میں یونس امرے کے پیغام کا حوالہ، اس کا موازنہ حضرت رابعہ بصریؒ کے اس قول سے کیا۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک ہاتھ میں پانی کا پیالہ اور دوسرے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل لے کر بازاروں میں پھرا کرتی تھیں۔ کسی شخص نے ان سے پوچھا کہ آپ پانی کا پیالہ اور جلتی ہوئی مشعل لے کر کیوں پھرتی ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں اس پانی کے پیالے سے دوزخ کی آگ بجھا دینا چاہتی ہوں اور مشعل سے میں بہشت کو آگ لگا دینا چاہتی ہوں تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ سے محض محبت کی خاطر اس کی اطاعت کریں نہ کہ اس لالچ کی وجہ سے کہ مجھے اس کا بہشت کی صورت میں اجر ملے گا، یا دوزخ میں سزا ملے گی تو میں دوزخ اور بہشت کو اس لیے ختم کرنا چاہتی ہوں تاکہ لالچ سے ہٹ کر بے لوث محبت کو فروغ حاصل ہو، اگر یہ حاصل ہو تو انسان کی انسان سے انسانیت کی وجہ سے محبت بڑھے گی۔

میں ترکی میں تین دفعہ جا چکا ہوں میں نے بھی ہر دفعہ یہ محسوس کیا کہ ترک لوگ بتدریج اسلام کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں۔ ان کا سکولرازم انیسویں اور بیسوی صدی کی کرپٹ اور بنیادی طور پر غیر اسلامی خلافت اور اس کے حامی عوام دشمن ملاؤں کے خلاف ایک ردعمل تھا۔ اب وہ قرآنی احکامات اور مولانا رومیؒ جیسے صوفیا کے زیر اثر اسلامی روح سے متاثر ہو کر واپس اسلام کی طرف آ رہے ہیں۔

سلجوق یونیورسٹی

قونیہ میں مولانا رومؒ کے مزار پر حاضری کے بعد میرے لیے دلچسپی کا محور قونیہ کی سلجوق یونیورسٹی تھی، جہاں میرے پرانے دوست ارکان ترکمان پڑھاتے تھے۔

قونیہ کا بسوں کا اڈا چونکہ شہر سے باہر اور مولانا رومؒ کے مقبرہ سے دور تھا اس لیے میں نے مولاناؒ کے قرب والا ہوٹل چھوڑ دیا اور بس اڈے کے نزدیک ایک نئے ہوٹل میں منتقل ہو گیا تا کہ وقت بچ جائے اور اگلے دن ارکان ترکمان سے مل کر اپنی اگلی منزل کی طرف جلد روانہ ہو سکوں۔

اگلی صبح میں نے ہوٹل کی انتظامیہ سے کہا کہ مجھے ٹیکسی منگوا کر دیں تا کہ میں سلجوق یونیورسٹی جا سکوں۔ ہوٹل مینیجر نے اپنے پاکستان دوست ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی شہر سے تقریباً25 کلومیٹر دور تھی اور میرے لیے وہاں ٹیکسی میں جانا اور آنا بہت مہنگا پڑے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس وقت کم ہے اور میں جلد از جلد یونیورسٹی پہنچنا چاہتا ہوں تا کہ جلد واپس آ کر اپنی اگلی منزل کی طرف جلد روانہ ہو سکوں، مگر اس نے پھر بھی ٹیکسی نہ منگوائی۔

ہوٹل کے مینیجر نے اپنے ایک ماتحت سے ترکی میں کچھ کہا جو میں سمجھ نہ سکا۔ اس ترک نوجوان نے میرا بکس اٹھا لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا، لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی اور ہم چل پڑے۔ چلتے چلتے ہم ایک بس اسٹاپ پر پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سلجوق یونیورسٹی کی بس آ کر رکی۔ میرے ساتھی نے میرا بکس مجھے پکڑا کر بس میں سوار ہونے کو کہا۔ میں نے دیکھا کہ بس تو پہلے ہی سے یونیورسٹی کے طلباء اور طالبات سے مکمل طور پر بھری ہوئی تھی۔ کھڑے ہونے کی جگہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی، مگر میرے ساتھی نے مجھے تقریباً دھکا دے کر بس میں سوار کر دیا اور ساتھ ہی

بس ڈرائیور سے ترکی میں کچھ کہا، جس میں سے میں صرف ایک لفظ پاکستان ہی میں سمجھ سکا۔

پاکستان کا نام سن کر بس میں کھڑے طلبا نے میرے لیے جگہ بنائی اور اپنے آپ کو مزید سمیٹ لیا، میں نے بس ڈرائیور کی طرف ٹکٹ کے لیے کرنسی نوٹ بڑھایا، مگر اس نے پیسے لینے سے انکار کردیا۔ اس نے ترکی میں کچھ کہا جس میں ایک لفظ کاردیش (بھائی) تھا یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پاکستان بھائی سے پیسے نہیں لے گا۔ میں نے اپنے قریب کھڑے طالبعلم سے انگریزی میں کہا وہ بس ڈرائیور سے کہے کہ وہ میری ٹکٹ کے پیسے لے لے۔ مگر اس نوجوان نے بھی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ایسا کرنے سے انکار کردیا، پھر اس نے کہا کہ ہم سب پاکستان اور اس کے لوگوں کو پسند کرتے ہیں، لیکن جو زبان یعنی انگریزی آپ لوگ بولتے ہیں ہم اسے ناپسند کرتے ہیں۔ میں نے کچھ جھینپتے ہوئے اس سے کہا کہ زبان تو کوئی بھی خراب نہیں ہوتی اور پھر ہم تو اسے رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں اس لیے کہ انگریزی ہی بین الاقوامی زبان ہے اس لیے اس کا استعمال ایک مجبوری ہے۔ وہ طالبعلم خاموش رہا۔ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ میری وضاحت سے مطمئن نہیں تھا۔

سلجوق یونیورسٹی میں ارکان ترکمان سے ملنا اور وہ بھی اتنے سالوں بعد ایک انتہائی خوش کن تجربہ تھا۔ وہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ہم بیتے دنوں کا ذکر کرتے رہے۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر میری مہمان نوازی میں جت گئے اور کافی اور بسکٹوں کے دور چلتے رہے۔

ڈاکٹر ارکان ترکمان نے ان کے ڈیپارٹمنٹ میں اردو پڑھنے والے طلباء اور طالبات کو اپنے کمرے میں بلوا کر مجھ سے ملوایا۔ انھوں نے طلباء اور طالبات سے کہا کہ وہ مجھ سے اردو میں بات چیت کریں اور اردو میں کسی بھی موضوع پر مجھ سے سوالات کریں۔ اس موقع پر میں نے بھی پوری طرح باتونی بننے کی کوشش کی تا کہ وہ طلبا اردو کی مشق بھی کریں۔

میرا دل اس دلچسپ اور دل خوش کن ماحول کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، لیکن مسافر کو تو آخر جانا ہی ہوتا ہے۔ مجھے باہر آکر رخصت کرتے وقت ارکان ترکمان نے اپنے ان طلبا سے جو شہر کی طرف جا رہے تھے کہا کہ وہ مجھے بس تک چھوڑ آئیں۔ ان میں سے تین لڑکیاں جن کے سر ڈھکے ہوئے تھے فوراً میرے ساتھ ہولیں۔ ایک لڑکی نے میرا بیگ اٹھا لیا اگرچہ میں منع کرتا رہا۔ دوسری لڑکی نے تیزی سے بڑھ کر میرے لیے بھی بس کا ٹکٹ خرید لیا۔ بس کے اندر جب میں نے بس ڈرائیور سے ٹکٹ لینا چاہا تو اس نے مجھے بتایا کہ میرا ٹکٹ تو پہلے سے خریدا جا چکا تھا۔ میں نے اس لڑکی کو ٹکٹ کے پیسے دینے کی اپنی سی پوری

کوشش کی،لیکن میری ایک نہ چلی۔اس طرح میں مفت بڑے اڈے تک پہنچ گیا۔

جب ہم بس کے بڑے اڈے پر پہنچے تو میرے ساتھ وہ تینوں لڑکیاں بھی یونیورسٹی کی بس سے اتر کر میرے ساتھ ہو لیں قونیہ سے مجھے تقریباً دو سو کلومیٹر دور گوریمے (Goreme) جانا تھا۔اس دفعہ بھی ان میں سے ایک لڑکی نے جلدی کر کے ایک کھڑکی سے میرے لیے خود پیسے دے کر ایک ٹکٹ خرید لیا،مگر اس دفعہ میں اڑ گیا اور میں نے کہا کہ جب تک وہ اس ٹکٹ کے پیسے مجھ سے نہ لیں گی میں یہ سفر ہی نہیں کروں گا۔مجبور ہو کر انھوں نے بادل ناخواستہ مجھ سے بس ٹکٹ کے پیسے لیے۔

اب ان لڑکیوں کی کوشش تھی کہ میری روانگی سے پہلے وہ مجھے کھانا کھلا دیں۔ان کا تقاضا تھا کہ چونکہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا اس لیے میں بھوکے پیٹ اتنا لمبا سفر نہ کروں۔میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر ارکان نے دو دفعہ کافی اور بسکٹ کھلا کر میری بھوک ختم کر دی تھی اس لیے کھانے کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ لڑکیاں اپنی مہمان نوازی مجھ پر مسلط کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔انھیں غالباً پہلی دفعہ ایک پاکستانی سے ملنے کا موقع ملا تھا جس کی خاطر تواضع کرنا ان کے قومی فرائض میں شامل تھا۔

ان طالبات کے پرزور اصرار اور میری طرف سے بار بار معذرت نے دیگر ترکوں کو بھی ہماری طرف متوجہ کر دیا۔ایسی صورتحال میں مجھے خفت سی محسوس ہو رہی تھی اور میری شدید خواہش تھی کہ یہ لڑکیاں میری جان چھوڑ دیں اور میرا تماشا بننا ختم ہو۔بڑی مشکل سے انھوں نے میری بات مانی۔لیکن وہ میرا سامان اٹھائے بس تک میرے ساتھ آئیں۔انھوں نے بس ڈرائیور سے بات کر کے سب سے آگے والی بہترین سیٹ میرے لیے مخصوص کرا دی۔میں ان سے پچیس تیس سال بڑا آدمی ان لڑکیوں کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو بچہ محسوس کرنے لگا تھا۔

بس چلنے تک یہ لڑکیاں باہر کھڑی رہیں اور بس چلنے کے بعد دیر تک ہاتھ ہلا کر انھوں نے مجھے رخصت کیا۔جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو اچانک مجھے اس قسم کا احساس ہونے لگا جو اس باپ کو ہوتا ہے جس کی لڑکی شادی کے بعد کہیں دور دراز علاقے کی طرف رخصت ہو رہی ہو۔میرے لیے تو اس احساس میں مزید شدت پیدا ہو گئی کہ مجھے تو آیندہ زندگی بھر ان سے ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔اس سوچ سے بے اختیار میری آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

گوریمے

ترکی سیاحت میں گریمے کی قدیم وادی میں کپاڈوکیا کا انوکھا اور عجیب وغریب علاقہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ علاقہ میلوں پھیلا ہوا ہے، جس میں لاوے سے مخروطی طرز کی سیکڑوں پہاڑیوں کا عجیب وغریب سا سلسلہ بنا ہوا ہے۔ یہ زمینی لاوے سے بنی نرم بھربھرے پتھروں کی ریتلی پہاڑیاں ہیں جن کو کھود کر قدیم زمانے سے گھر اور عبادت گاہیں بنائی گئی ہیں۔ یہاں زمینی سطح سے نیچے بھی غاریں کھود کر رہائشیں بنائی گئی ہیں اور غاروں کا جال دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب 1200ء قبل مسیح حتیٰ (Hittite) تہذیب کے زمانے سے بنی چلی آرہی ہیں۔

یہ علاقہ تقریباً دو کلومیٹر لمبا اور ایک کلومیٹر کی چوڑائی پر مشتمل ہے جسے ترکی کا کھلا عجائب گھر (Open air Museum) کہا جاتا ہے۔

یہ قدیم شہر تقریباً اس وقت متروک شہر ہے، اگرچہ یہاں کی نرم پہاڑیوں کو کھود کر سیکڑوں رہائشیں اور رومن زمانے کے چرچ بنائے گئے ہیں جو سب خالی ہیں۔ کہیں کہیں پہاڑیوں کو کھود کر بنائے گئے گھر ایسے ہیں، جہاں کچھ لوگ رہائش پذیر ہیں۔ ان میں دیہاتی عورتیں قالین بافی میں مصروف نظر آتی ہیں۔ ورنہ یہ بھوتوں کا شہر (Ghost City) لگتا ہے۔ ہر طرف ہو کا عالم ہے۔

اس پورے سلسلے کے درمیان میں وہاں ایک پتلی سی پکی سڑک ہے جہاں آپ صرف پیدل چل کر اس اوپن ائیر عجائب گھر کی سیر کر سکتے ہیں یا ترکی کے سیاحتی محکمے کی کچھ گاڑیاں یہاں نظر آتی ہیں۔ یہاں کے مرد اس قسم کی مخروطی ٹوپیاں پہنتے ہیں، جس طرز کی یہاں پہاڑیاں ہیں۔

اس علاقے کے شروع میں ایک قدرے بڑی پہاڑی کو کھود کر ایک ہوٹل بنایا گیا

ہے، جہاں رہائش کمرے غاریں ہیں۔ ہوٹل کی لابی اور ہال بھی پہاڑی کھود کر بنائے گئے ہیں۔ البتہ ہوٹل کا فرنیچر اور کراکری نئے زمانے کی ہیں۔

اس غاروں والے ہوٹل کے اہلکاروں نے مجھے خوش آمدید کہا اور جب انھیں پتا چلا کہ میں پاکستانی ہوں تو انھوں نے برملا خوشی کا اظہار کیا۔ میں نے ہوٹل میں کافی پینے کے بعد اپنا بریف کیس ان کے حوالے کر کے اوپن ائیر میوزیم کو دیکھنے کے لیے پیدل نکل پڑا۔ اس وقت تک زیادہ سیاح نہیں آئے تھے اور پورا علاقہ بھوت شہر لگتا تھا۔ غاروں میں بنے ہوئے قدیم گھر اور چرچ بے حد پراسرار لگ رہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

ایک بڑی سی پہاڑی کو کھود کر بنائے گئے ایک بڑے غار کے اندر دور سے کچھ نقش و نگار نظر آئے۔ میں اس طرف چل پڑا۔ وہاں چار پانچ گورے سیاح پہلے سے موجود تھے۔

اندر جا کر معلوم ہوا کہ یہاں کے پانچ چرچوں میں سے یہ سب سے بڑا اور سب سے پرانا چرچ تھا جو قبل از اسلام سلطنت روما کے زمانے میں کھدائی کر کے بنایا گیا تھا۔ اس میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریم کی شبیہیں کافی حد تک اپنی اصلی حالت میں موجود تھیں اور اس علاقے میں عربوں اور بعد میں عثمانیوں کے قبضے کے باوجود بھی انھیں تباہ نہیں کیا گیا تھا۔ یہ مسلمانوں کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ چرچ سلطنت روما کے زمانے میں بارسلونا کے مشہور چرچ کے نمونے پر بنایا گیا تھا۔

جنگ اول اور ترکوں کی انگریزوں اور یونانیوں کے ساتھ جنگ میں یہاں کے غاروں والے چرچوں اور گھروں کو تھوڑے عرصہ کے لیے بطور گودام بھی استعمال کیا گیا تھا۔

غاروں والے عجوبہ شہر کو دیکھنے کے دوران اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے ہوٹل میں چھوڑے گئے اپنے بریف کیس کو تالہ نہیں لگایا تھا۔ اس میں میرے پاسپورٹ کے علاوہ ڈالر اور مقامی کرنسی بھی تھی، مگر دوسرے ہی لمحے مجھے یہ سوچ کر تسلی سی ہوئی کہ میرے ترک بھائی میرے ساتھ کوئی خیانت نہیں کریں گے۔ چنانچہ جب میں واپس ہوٹل پہنچا اور سامان کو چیک کیا تو مجھے اپنی ہر چیز محفوظ ملی۔

گوریمے کی مخروطی پہاڑیوں میں سیکڑوں کی تعداد میں کبوتروں کے گھونسلے بھی بنائے گئے ہیں ۔ اردگرد کے کسان کبوتروں کی موجودگی کو فائدہ مند سمجھتے ہیں۔ وہ ان جنگلی کبوتروں کی بیٹوں کو اپنے کھیتوں میں بطور کھاد استعمال کرتے ہیں جس سے ان کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔

ابھی میں ہوٹل کی لابی میں بیٹھا ہی تھا کہ دوسری طرف ٹی وی دیکھنے والا ایک ترک نوجوان

پریشانی کا تاثر لیے میرے پاس آیا اور مجھے ٹی وی کی طرف آنے کو کہا۔ ٹی وی پر پاکستان میں ہونے والے ایک بڑے حادثے کی خبر اور فوٹیج دکھائی جا رہی تھی۔ ہوٹل کے ترک اہلکاروں نے ایک ایک کر کے مجھ سے اظہار ہمدردی کیا۔ ترک پاکستان کی اس خبر کو اس تفصیل سے دکھا رہے تھے جیسے یہ ان کے اپنے ملک میں ہوا ہو۔

دیہاتی ترک

واپسی پر میں نے ہوٹل والوں سے پوچھا کہ نوشہر جانے کے لیے مجھے ٹیکسی کہاں سے ملے گی، کیوں کہ صبح یہاں پہنچ کر میں نے اپنی ٹیکسی چھوڑ دی تھی۔ ہوٹل کے انچارج اہلکار نے کہا کہ ایک تو وہاں ٹیکسی کے آنے میں کچھ وقت لگ جائے گا دوسرے وہ مجھے مہنگی بھی پڑے گی۔ انھوں نے آپس میں کوئی بات کی اور ایک ترک نوجوان میرا بریف کیس اٹھا کر چل پڑا اور مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ میں مجبوراُس کے ساتھ چل پڑا۔

تھوڑی دیر بعد ہم ویگن کے ایک اڈے پر پہنچ گئے۔ میرے ساتھی نوجوان نے ایک چھوٹی ویگن کے ڈرائیور سے کہا کہ یہ پاکستانی بھائی ہیں انھیں اچھی سی نشست دو۔ اس ویگن میں زیادہ تر بلکہ تمام مسافر دیہاتی ترک تھے۔ میرا پاکستانی ہونے کا سن کر ایک دیہاتی مسافر جو سب سے آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا نے خودبخود اپنی سیٹ چھوڑ دی اور پیچھے جا بیٹھا۔ میں نے تکلف کرتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ میں نے اس کا شکریہ کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ پس پھر کیا تھا، تمام مسافروں نے بڑھ کر بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملائے۔ یہ ان کا پاکستان سے گہری محبت کا ثبوت تھا۔

میں نے بعد میں جب اپنے ایک سفارتکار دوست سے ترکوں کے اس قدر پرخلوص دوستانہ رویے کا ذکر کیا تو انھوں نے بتایا کہ ترکی میں وہ جب کسی دیہاتی علاقے یا چھوٹے شہر میں جاتے تھے تو جب وہاں لوگوں کو ان کے پاکستانی ہونے کا علم ہوتا تھا تو وہ لائن بنا کر ایک ایک کر کے پرخلوص طریقے سے ان سے آ کر ہاتھ ملاتے تھے۔

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ دہاتی ترک بھی ترکی اور پاکستان کی دوستی اور یگانگت سے اس قدر آگاہی رکھتے تھے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں پاکستان میں شہروں میں رہنے والے پڑھے لکھے لوگ بھی ترک اور پاکستان کی دوستی کے بنیادی عوامل سے اس قدر واقفیت نہیں رکھتے جو ترکی کے عام دیہاتی رکھتے ہیں۔

ترکی کی حکومت نے بھی ہر آڑے وقت میں پاکستان کا کھل کر ساتھ دیا ہے۔ خاص طور پر بھارت کے ساتھ جنگوں کے موقعے پر جب امریکہ اور یورپی ممالک پاکستان پر پابندی لگا دیتے تھے تو ہمیں دفاعی ساز وسامان اور سپئیر پارٹس صرف ترکی ہی مہیا کرتا تھا۔

1965ء کی جنگ میں میرے ایک بزرگ دوست پاکستان نیوی کے ایک جہاز میں ترکی سے کچھ فوجی سامان اور سپیرء پارٹس لا رہے تھے تو بھارت نے مصر کی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس پاکستانی جہاز کو سوئنر کینال میں روک دے، لیکن ترکی کی حکومت نے مصر کے صدر جمال ناصر پر سخت دباؤ ڈالا کہ وہ ہمارے جہاز کو روکنے سے باز رہے۔ چناں چہ بھارت سے زیادہ دوستی کے باوجود مصر نے ہمارا سامان نہ روکا۔ ایسی اور کئی مثالیں ہیں جو ترکی اور پاکستان کے گہرے تعلقات کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ پاکستان میں جب بھی قدرتی آفات سے جانی اور مالی نقصانات ہوتے ہیں تو ترکی دنیا میں پہلا ملک ہوتا ہے جو پاکستان کو مدد اور ڈھارس فراہم کرتا ہے۔

ادانہ

گوریمے کی پراسرار اور عجوبہ وادی اور غاریں دیکھنے کے بعد میری اگلی منزل ادانہ تھی جو ترکی کے جنوب مشرق میں ایک اہم شہر ہے۔

ادانہ کے اردگرد زرخیز میدانی علاقے ہیں جو ترکی کی زرعی معیشت کی بنیاد ہیں۔اس علاقے میں اور فصلوں کے علاوہ روئی بڑی مقدار میں پیدا ہوتی ہے۔

ادانہ سیحان دریا اور قدیم سارس دریا کے سنگم پر واقع ترکی کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ یہ شہر کئی تہذیبوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔اسے سکندر اعظم نے 335-334 قبل مسیح میں فتح کیا تھا۔ اس شہر کی بنیاد حتی (Hittite) تہذیب کے زمانے میں 2000ء قبل مسیح میں پڑی تھی۔ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں ادانہ بنو عباس کے زمانے میں یہ عربوں کے زیر اثر آ گیا تھا، پھر 1378ء میں یہ شہر ترکمان رمضان خانوادے کے تحت آ گیا۔اس کے بعد یہ 1608ء میں سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنا۔

میں ادانہ بطور خاص اس لیے آیا تھا کہ وہاں انھی دنوں میں زراعت اور زرعی آلات کی ایک بین الاقوامی نمائش منعقد ہو رہی تھی، چونکہ میرا خاندانی پس منظر بھی زراعت سے متعلق ہے اس لیے زرعی نمائش میں مجھے بطور خاص دلچسپی تھی۔

نوشہر سے ادانہ تک کا سفر خاصا طویل ہے۔اس لیے میں مغرب کے وقت کے قریب ادانہ پہنچا۔بس کے اڈے پر میں نے ٹکسی لی۔میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے زرعی نمائش کے نزدیک کسی ہوٹل میں پہنچا دے۔

ہوٹل کے عملے نے خوش دلی سے میرا خیر مقدم کیا۔انھوں نے ایک پاکستانی کو اپنے درمیان پا

کر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ہوٹل میں کچھ اور بھی غیر ملکی آئے ہوئے تھے، لیکن میرے آرام کا بطور خاص انتظام کیا جا رہا تھا۔ میرا سامان لے کر ہوٹل کا ملازم مجھے دیئے گئے بہترین کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں استقبالیہ میں اپنے کوائف وغیرہ درج کرانے لگ گیا۔

اچانک استقبالیہ کے ساتھ والے ہال کا دروازہ کھلا، جس میں سے ایک شعلہ جوالا خوبصورت خاتون نکلی۔ اس نے سرخ رنگ کا سکرٹ والا مغربی لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ سرخ و سفید رنگ اور کھلی ہوئی سیاہ زلفوں والی خاتون سپین کے مشہور فلیمنکو ڈانسر لگ رہی تھی۔ وہ غالباً اسی ہال کے نائٹ کلب کی ڈانسر تھی۔ اس نے انتہائی دلربا انداز میں میرے نزدیک آ کر مجھے گرمجوشی سے ہیلو کر کے مخاطب کیا۔ میں ابھی اس غیر متوقع حملے سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ہوٹل کے استقبالیہ کے انچارج نے اس خاتون کو مخاطب کر کے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا کہ وہ مجھ سے دور ہو جائے۔ اس کی باتوں میں کہیں کہیں لفظ پاکستان کا بار بار آ رہا تھا۔ پھر وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے مخاطب ہوا اور مجھے تلقین کی کہ میں اس خاتون کو لفٹ نہ کراؤں۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ خوبصورت عورت مجھے مسحور کر کے میری جیبیں نہ خالی کر دے اور وہ ایک پاکستانی کو لٹتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

اس خاتون نے بھی میرے پاکستانی ہونے کی وجہ سے مجھے معاف کر دیا، پھر اس نے دوستانہ اور شریفانہ انداز میں مجھ سے ہاتھ ملایا اور سنجیدگی سے کہا کہ اسے بھی پاکستان سے پیار تھا اس نے کہا آئی لو پاکستان I Love Pakistan اس کے بعد وہ مجھے گڈ بائی کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔ میں دل ہی دل میں محظوظ ہو رہا تھا کہ کس طرح وہ ترک نوجوان پاکستان دوستی میں میرا ہمدرد اور رکھوالا بن گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میری جگہ کسی من چلے کے لیے یہ صورت حال پسندیدہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے دل کی صورت حال کچھ اس مشہور مصرع کے مطابق ہوتی کہ مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو احساں ہوتا۔

دوسرے دن میں ادانہ کے مشہور عجائب گھر کی طرف چلا گیا۔ اس عجائب گھر میں یونانی اور رومن زمانے کے نوادرات رکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ سنگ مرمر پر قدیم سنگ تراشی قابل دید ہے۔ ان پر حسن کی دیویوں کے شبیہیں بڑی خوبصورتی سے کندہ کی گئی ہے۔ وہاں قدیم زیورات اور برتن بھی بڑی تعداد میں محفوظ ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

عجائب گھر سے نکل کر دوپہر سے کچھ پہلے میں زراعت سے متعلق بین الاقوامی نمائش میں پہنچ گیا۔ نمائش میں زرعی مشینری اور زرعی آلات کے بڑے بڑے سٹال لگائے تھے ان میں سے سب سے

بڑے سٹال امریکہ، یورپی ممالک اور اسرائیل کے تھے۔

امریکی اسٹال پر اور چیزوں کے علاوہ وہ دیوہیکل مشین بھی موجود تھی جو آٹومیٹک طریقے سے کھیتوں سے کپاس چنتی ہے۔ ہمارے ہاں پاکستان میں ایسی مشینری کا استعمال ابھی تک نہیں ہوا اور کپاس کے کاشتکاروں کو کپاس کی فصل پک جانے کے وقت بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ اس وقت کپاس چننے والے مرد اور عورتوں کے انتظام کرنے میں کئی مشکلات پیش آتی ہیں۔

میں نے امریکی سٹال پر کپاس چننے والی مشین کو دلچسپی سے دیکھنا شروع کیا تو وہاں امریکی سٹال کا انچارج ایک امریکن آ گیا۔ میں نے انگریزی میں مشین سے متعلق کچھ سوالات پوچھے تو وہ بڑا خوش ہوا، کیوں کہ مقامی لوگ تو عام طور پر انگریزی نہ بول سکتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ اب اس نے اس دیوہیکل مشین کی خصوصیات اور کارگزاری پر طویل لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اس کا لیکچر طویل سے طویل ہوتا چلا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ صبح سے اس وقت تک کسی نے اس سے انگریزی میں بات نہیں کی تھی اور کسر نکالنے کے لیے مجھ پر اس کا لیکچر لمبا ہوتا چلا گیا۔ اب میری کوشش تھی کہ وہ اپنا لیکچر مختصر کرے تاکہ میں نمائش کے دیگر اسٹال بھی دیکھ لوں، مگر اسے تو ایک محصور سامع (Captive Audiance) مل گیا تھا جسے وہ جلد نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے لمبا لیکچر دے کر وہ رکا اور میں نے اپنی جان چھڑائی۔ اس دوران اس کی بھڑاس بھی نکل گئی۔ نہ جانے کب سے یہ بھڑاس اس کے اندر بھری ہوئی تھی، جسے نکالنے کا اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔

نمائش میں اندازہ ہوا کہ اسرائیل نے تمام شعبوں میں انسانی محنت اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے ہر شعبے میں بہت ترقی کی ہے۔ زراعت کے میدان میں انھوں نے آبپاشی کے لیے پانی کی کمی کا علاج پودوں کو قطرہ قطرہ (Drip Irrigation) اور چھڑکاؤ (Sprinkle) کے ذریعے سے پورا کیا ہے۔ یہ اور دیگر زرعی آلات کے متعدد نمونے اسرائیل کے سٹال پر دیکھنے کو ملے۔

ترکی میں، اگرچہ وہاں کے دریا چھوٹے سائز کے ہیں، لیکن انھوں نے ان پر متعدد ڈیم بنا کر پانی ذخیرہ کرنے کا بہت عمدہ نظام کر رکھا ہے۔ ان کی زراعت میں مشینری کا استعمال بھی کافی بڑھ چکا ہے۔ جب کہ پاکستان میں زراعت کی ترقی کی طرف اتنی توجہ نہیں دی جا رہی، جس کی ضرورت ہے۔

اگلے دن میں ادانہ کی تاریخی عمارات دیکھنے کے لیے گیا۔ ہوٹل کے منیجر نے مجھے بتایا کہ وہاں سے نزدیک ہی شہر کی سب سے بڑی اور قدیم مسجد (Ulu jame) دیکھنے کے قابل ہے، چناں چہ میں

اس طرف پیدل ہی چل پڑا۔

یہ قدیم مسجد تقریباً آٹھ سو سال پرانی ہے۔ اس کی قدامت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مسجد کے صدر دروازے پر دہلیز پر لگایا گیا سنگ مرمر انسانی پاؤں کی رگڑ سے گھس کر تقریباً نصف سائیز کا رہ گیا ہے۔ یہ مسجد چھوٹی سرخ اینٹوں اور کاشی کی خوبصورت ٹائلوں سے بنائی گئی ہے۔ مسجد کے صحن میں پہنچ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں ملتان کے کسی قدیم مقبرے یا مسجد میں آ گیا ہوں۔ یہاں بھی کاشی کے کام میں نیلی ٹائیلوں کا استعمال زیادہ ہے۔ دوسرے خوبصورت رنگوں کا استعمال نسبتاً کم ہے۔

مسجد میں دو رکعت نفل ادا کرنے کے بعد میں مسجد سے ملحقہ مدرسے کی عمارت کی طرف چلا گیا۔ یہ خاصا بڑا مدرسہ ہے جو چھوٹی سرخ اینٹوں سے بنایا گیا ہے۔ مدرسہ اس وقت مکمل طور پر خالی اور متروک حالت میں ہے۔ ترک خلافت کے خاتمے کے بعد ترکی میں سیکولرازم کے غلبے کی وجہ سے سرکاری سرپرستی اور مالی امداد ختم ہو گئی اور مدرسے ویران ہو گئے۔ اب نئے امام مسجد سیکولر سکولوں میں اسلامی تعلیمات حاصل کر کے مساجد میں صرف ایک یعنی حنفی فرقہ کے تحت متعین کیے جاتے ہیں۔ اس لیے قدیم طرز کے مدرسوں اور مختلف قسم کے نصاب پڑھانے کی ضرورت نہیں رہی۔

میں مدرسے کے قدیم طرز تعمیر کو گھوم پھر کر دیکھ رہا تھا کہ ایک جگہ مجھے چار اشخاص چھوٹے چھوٹے سٹولوں پر بیٹھے نظر آئے وہ اس ماحول میں روایتی چار درویش جیسے لگ رہے تھے۔ وہ مجھ اجنبی کو وہاں دیکھ کر چونک سے گئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے گلاس تھے، جن میں وہ روایتی ترکی کافی پی رہے تھے۔ میں نے ان کے نزدیک جا کر سلام کیا، جس کا انھوں نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ان میں سے ایک نے ترکی میں کچھ کہا۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں ان کی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس نے پوچھا ''مملکت؟'' یعنی میں کس ملک سے تعلق رکھتا تھا۔

میں نے یک لفظی جواب دیا ''پاکستان''۔ پاکستان کا نام سنتے ہی ان کے چہرے کھل اٹھے۔ ان میں سے ایک نابینا شخص بھی تھا، جس کا نام مراد بے تھا۔ اب ان کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کے ساتھ چائے یا کافی پیوں۔ ان میں سے ایک باہر جا کر جلدی سے ایک سٹول لے آیا۔ ان کے خلوص نے مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ایک صاحب نے میرے لیے کافی لا کر میرے ہاتھ میں دے دی۔

کافی کی چسکیوں کے دوران ہم بڑی مشکل سے ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کی

کوشش کرتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے دل بڑی آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ ہمکلام تھے۔ اس دوران میں نے ان چاروں کو اپنے وزیٹنگ کارڈ دیے۔ ایک کارڈ میں نے نابینا مراد بے کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے اسے ٹٹولا پھر اسے چوما اور ماتھے سے لگایا۔ روحانی طور پر نابینا شخص مراد بے کی یہ عقیدت اور عزت میرے لیے نہیں، بلکہ میرے وطن پاکستان کے لیے تھی۔ شدت جذبات کے تحت میرے لیے آنسو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ رخصت ہوتے وقت ہم بغل گیر ہو کر جدا ہوئے۔ قدیم مسجد اور مدرسے سے نکل کر میں پرانا قلعہ کے آثار اور کچھ اور مقامات دیکھ کر واپس اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔

قبرص

میری خواہش تھی کہ میں قبرص جا کر استنبول تک واپسی کا سفر بحرہ اوقیانوس (بحرہ روم) کے ساتھ ساتھ واقع تاریخی مقامات اور شہروں کو دیکھتے ہوئے جاؤں۔

قبرص ایک ایسا جزیرہ ہے، جس پر ترکوں اور یونانیوں کے درمیان اس قسم کا تنازع ہے، جیسا کشمیر کے معاملے میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یونانیوں نے برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک کے ساتھ مل کر قبرص پر قبضہ کر لیا اور وہاں کی ترک آبادی کو ہر قسم کے استحصال کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے ترکوں کے لیے جینا دوبھر کر دیا۔ ترکی نے بہت کوشش کی کہ پر امن طریقہ سے قبرص کے ترکوں کے انسانی حقوق کی پامالی کو روکا جائے، لیکن یونان ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس دوران پاکستان ہر سطح پر ترکی کا ساتھ دیتا رہا، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

بالآخر تنگ آ کر ترکی نے 1974ء میں قبرص کے شمالی علاقے میں اپنی فوجیں اتار دیں اور ترکوں کی اکثریت والے حصے کو یونانی حصے سے الگ کر دیا۔ اس طرح ترک نژاد قبرصیوں کا ایک آزاد ملک وجود میں آ گیا۔ اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں اس وقت ترکی کے حق میں جو اکیلا ووٹ تھا وہ پاکستان کا تھا۔ اس وقت پاکستان نے امریکہ یا کسی اور بڑی طاقت کا ساتھ نہ دیا تھا۔

کراچی سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے شمالی قبرص کے انتخابات میں منتخب ہونے والے نئے صدر کو مبارک باد کا خط لکھا تھا۔ اس خط میں میں نے لکھا تھا شمالی قبرص کی آزادی ایسی ہے، جیسے پاکستان کی آزادی جو اس نے ہندوستان سے الگ ہو کر حاصل کی تھی اور استحصالی ہندوؤں سے اپنی جان

چھڑائی تھی۔ برصغیر کی ہندو اکثریت نے تمام وسائل پر قبضہ جمانے کے علاوہ معاشرتی طور پر مسلمانوں کی حیثیت اچھوتوں سے بھی کم کر رکھی تھی۔

میرے خط کے جواب میں شمالی قبرص کے ترک صدر نے قبرص کے ترکوں کے لیے پاکستان کے رول کو بھرپور طریقے سے سراہا اور مجھے دعوت دی کہ موقع ملنے پر میں ان کے ملک میں آؤں اور ان سے ملاقات بھی کروں۔

قبرص جانے کے لیے ترکی کی جنوبی بندرگاہ میرسن (Mersin) سے بذریعہ جہاز کا سفر چند گھنٹوں پر محیط ہے، چناں چہ میں ادانہ سے بذریعہ بس مرسن کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ہماری بس تھوڑی دیر کے لیے ایک چھوٹے، مگر قدیم شہر تارسس (Tarsus) میں رکی اور چیزوں کے علاوہ اس شہر کی اہمیت یہ ہے کہ یہ عیسائیوں کے بہت بڑے رہنما سینٹ پال (St. Paul) کا شہر تھا، جنھوں نے یہاں سے نکل کر عیسائی دنیا میں تاریخی تبدیلیاں روشناس کرائیں۔ ابتدائی طور پر یہ کٹر یہودی اور عیسائیت کے دشمن تھے۔ بعد میں یہ کٹر عیسائی بن گئے کہا جاتا ہے کہ سینٹ پال ہی وہ پہلے عیسائی رہنما تھے، جنھوں نے ٹرینٹی (Trinity) یعنی اللہ کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کو بھی الوہیت کا درجہ دے کر اس نظریے کو عیسائیوں میں قبول عام کیا تھا۔ اس سے پہلے عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا نہیں سمجھتے تھے۔

عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں نے مختلف اوقات میں بائبل میں تبدیلیاں کر کے اسے اصلی حالت میں نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے کراچی، صدر میں واقع چرچ کی کتابوں کی دکان میں ایک ہی جلد میں ایسی بائبل کو دیکھنے کا موقع ملا، جس میں خالص کلام الٰہی کو سرخ روشنائی میں علیحدہ دکھایا گیا تھا۔ باقی بائبل سیاہ روشنائی میں تھی۔ اس میں کلام الٰہی بمشکل دس بارہ فیصد تھا۔ باقی بائبل انسانوں نے لکھی تھی۔ تارسس سے چل کر ہماری بس ایک گھنٹے میں مرسن پہنچ گئی۔

قبرص رومی بحری طاقت کی ایک بیرونی بڑی چوکی تھی 28 ہجری میں امیر معاویہ نے شامی بحری بیڑے کے ذریعے اس پر حملہ کیا۔ قبرص کے حاکم نے ڈر کر صلح کر لی۔ وہ مسلمانوں کو سات ہزار دو سو دینار دینے پر راضی ہو گیا اور اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ آیندہ رومیوں کو کوئی مدد بھی فراہم نہیں کرے گا۔ اس مہم میں حضرت ام حرامؓ اپنے شوہر عبادہ بن الصامت کے ساتھ شریک تھیں۔ ان کو نبی کریمؐ نے بشارت دی تھی کہ وہ شہادت کا رتبہ حاصل کریں گی۔ اتفاق سے وہ گھوڑے سے گر کر ایک حادثہ میں وفات پا گئیں۔ اس طرح وہ قبرص میں شہید ہوئیں۔

قبرص سے پسپائی

قبرص جو مسلمانوں کے ہاتھوں پہلے فتح ہو چکا تھا اس کے بارے میں بلازری اپنی تصنیف فتوح البلدان میں لکھتے ہیں کہ امیر معاویہ کے بیٹے یزید کو بہت بڑی رشوت دی گئی تھی، جس کے عوض اس نے قبرص سے مجاہدین کو واپس بلا لیا اور اس کے بعد مسلمانوں کا تعمیر کردہ شہر (مدینہ) اور اس کی مساجد منہدم کر دی گئیں۔ (فتوح البلدان 182)

قبرص کو بعد میں ترکوں نے فتح کیا۔

میرسن

مرسن ترکی کی اہم ترین بندرگاہ ہے۔ اس کی اہمیت کی وجہ سے اسے بحرہ روم کا موتی (Pearl of Mediteranean) کہا جاتا ہے۔ تجارتی طور پر سب سے بڑی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہ ترکی کی معیشت کے لیے بے حد اہم درجہ رکھتی ہے۔

مرسن کا ساحل نویں صدی قبل مسیح سے آباد ہے۔ بعد کی صدیوں میں یہ شہر کئی تہذیبوں کا گہوارا رہا ہے۔ ان میں قدیم حتی، اسیرین، فارسی، یونانی، سلجوق اور لاگہ (Lagids) تہذیبیں شامل ہیں۔ بعد میں یہ رومی سلطنت کا حصہ بنا۔ 395ء میں جب رومی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی تو یہ بازنطینی عیسائی سلطنت کا حصہ بنا۔ عربوں نے مرسن کو ساتویں صدی عیسوی میں فتح کیا۔ بعد میں یہ پھر بازنطینی سلطنت میں چلا گیا۔ عثمانی ترکوں نے سلیم اول کے زمانے میں اسے 1517ء میں فتح کر لیا۔

تارسس سے مرسین کے سفر کے دوران میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا ایک موٹا سا گورا چٹا شخص آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے آپس میں بات چیت شروع کر دی۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرا ساتھی ایک اسرائیلی تھا اور سمندری جہاز کا کپتان تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ میں پاکستانی ہوں تو وہ مجھے غور سے دیکھنے لگ گیا۔ غالباً اس نے پہلی دفعہ ایک پاکستانی کو دیکھا تھا اور سوچتا ہوگا اس علاقے میں پاکستانی کا کیا کام ہوسکتا ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا کہ اس کی خواہش تھی کہ فلسطین کا مسئلہ پرامن طریقے سے حل ہو جائے اور دیگر مسلمان ممالک بھی اسرائیل کے ساتھ سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم کر لیں وغیرہ وغیرہ مرسن پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ بندرگاہ کے نزدیک مجھے ایک صاف ستھرے ہوٹل میں کمرہ مل گیا۔ ہوٹل کا مالک بڑا خوش اخلاق ترک تھا۔

ہوٹل کا ایک ملازم مصطفیٰ تھوڑی بہت انگریزی جانتا تھا وہ خود بخود میرا گائیڈ بن گیا۔

مصطفیٰ مجھے ٹیکسی میں لے کر مرسن کے فیشن ایبل علاقے کی طرف لے گیا جو ایک روشنیوں کا شہر لگ رہا تھا۔ بڑی بڑی دکانیں مقامی اور درآمد کیے گئے سامان تعیش کی اشیا سے بھری پڑی تھیں اور گاہکوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ چلتے چلتے ایک جگہ نائٹ کلب آیا۔ مصطفیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کلب کا شو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا مجھے اس کا کوئی شوق نہیں ہے۔ دوسرا میں تو تھوڑے سے پیسے لے کر ہوٹل سے آیا تھا۔ اتنے میں ایک خوبصورت لڑکی جو غالباً اس کلب کی ڈانسر تھی آئی اور کلب میں داخل ہو گئی۔ اس نے ہمیں کلب سے سامنے کھڑے باتیں کرتے دیکھا تو وہ رک کر ہم سے مخاطب ہوئی اور وہاں رکے رہنے کی وجہ پوچھی۔ مصطفیٰ نے اسے بتایا کہ میں ایک پاکستانی سیاح تھا، لیکن یہ کہ میں اپنے ہوٹل سے بہت کم پیسے لے کر محض گھومنے کے لیے آیا تھا۔ اس لڑکی نے مسکرا کر مجھے خوش آمدید کہا اور مصطفیٰ سے ترکی میں کہا کہ اگر ان کے پاس پیسے کم ہیں تو کوئی بات نہیں یہ چوں کہ پاکستانی مہمان ہیں اس لیے جو یہ دیں گے وہ ہم لے لیں گے۔ میں حیران رہ گیا کہ اس قسم کے لوگوں کو بھی پاکستان سے اتنا پیار تھا کہ وہ ہر قیمت پر ایک پاکستانی کو تفریح فراہم کرنے پر تیار تھیں، مگر میں نے شکریہ ادا کیا اور ہم وہاں سے آگے نکل گئے۔ راستے میں ہمیں اس قسم کے اور بھی کلب نظر آئے۔

ترکی میں سیکولرازم کی وجہ سے وہاں مغربی طرز زندگی کی نقل کے ثبوت ہر شہر میں نظر آتے ہیں۔ بطور خاص بندرگاہ والے شہروں میں یہ زیادہ نظر آتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ عالی شان مساجد میں خاصی بڑی تعداد میں ترک نمازیوں کی موجودگی یہ حقیقت بیان کرتی ہے کہ ترکی سے اسلام مکمل طور پر کبھی خارج نہیں ہوا تھا اور نہ خارج کیا جا سکے گا، بلکہ ترکی کے پڑھے لکھے ماڈرن لوگ بھی اسلام کی طرف آ رہے ہیں۔ حج اور عمرہ کے اجتماعات میں بھی ترکوں کی موجودگی ہر سال بڑھتی جا رہی ہے۔ ان میں تعلیم یافتہ اور ماڈرن نوجوانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

دوسرے دن صبح صبح ہی میں قبرص جانے کے لیے مرسن کی بندرگاہ پر پہنچ گیا۔ وہاں ایک سیاحتی کمپنی کے دفتر سے جہاز کا ٹکٹ جاری ہوتا ہے۔ میں نے وہاں موجود خاتون اہل کار سے قبرص کا ٹکٹ مانگا۔ میں چوں کہ غیر ملکی تھا اس لیے اس نے بتایا کہ مجھے انقرہ سے قبرص حکومت کے ایک دفتر سے سفر کرنے کے لیے ایک مخصوص پرمٹ لے کر آنا ہے، مگر معلومات نہ ہونے کی وجہ سے میں انقرہ سے یہ پرمٹ نہیں لایا تھا۔ اس طرح میرا قبرص جانے کا پروگرام ختم ہو گیا۔

بندرگاہ سے واپس آنے کے بعد میں نے مرسن میں یادگاریں دیکھیں جو 1920ء میں ترک فوج کی تاریخی فتح کی یاد میں بنائی گئی ہیں۔ اس وقت یہ شہر دوبارہ ترک سلطنت میں شامل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کے پارک بھی قابل دید ہیں۔

انطالیہ

میری اگلی منزل ترکی کا خوبصورت تاریخی اور تفریحی شہر اناطولیہ تھا۔ مرسن سے اناطولیہ تک سڑک بالکل سمندر کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے اور بحرہ روم کا خوبصورت سمندر سفر کے دوران ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ دوسری طرف سرسبز پہاڑیاں اور پھولوں کے باغات اور کھیت بڑا دلفریب نظارا پیش کرتے ہیں۔

ترکی میں اناطولیہ سیاحوں کی جنت کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہاں کے خوبصورت ساحل (Beaches) دور دور سے سیاحوں کو کھینچ لاتے ہیں۔ جہاں امیر لوگ اپنی قیمتی کشتیوں یا تفریحی جہازوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے آتے ہیں۔ یورپی اور امریکی سیاح چمکتے ہوئے سورج کی خوش کن تپش کا مزہ لینے کے لیے ریتلی بیچ پر لیٹے رہتے ہیں۔

اناطولیہ کو ترکی کا ریویرا Turkish Reveral کہا جاتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ مشہور فرانسیسی ریورا ہیں۔ جہاں دنیا کا سب سے بڑا فلمی میلہ بھی لگتا ہے۔ وہاں ایسے علاقے بھی مخصوص کئے گئے، جہاں بحرہ روم کے ساحل پر ایسی جگہیں، جنھیں Topless Beaches ہیں جہاں امیر کبیر خواتین سورج کی روشنی اور تپش حاصل کرنے کے لیے لیٹی رہتی ہیں، لیکن اناطولیہ میں اس قسم کی کوئی بیچ نہیں ہے، جب کہ باقی تمام لوازمات ایسے ہی ہیں جو فرانس کے ساحلوں پر مہیا کیے گئے ہیں یعنی پر تعیش ہوٹل، نائٹ کلب، کیسینو وغیرہ

میں اناطولیہ کے ساحل پر اکیلا گھومتا رہا اور تھوڑی دیر کے لیے ایک نوجوان ترک ملاح کے ساتھ کشتی میں گیا۔ اس کے بعد میں رومن زمانے کی قدیم نشانیوں اور کھنڈرات دیکھنے گیا۔

اناطولیہ کی قدیم عمارتوں میں رومی زمانے کا قدیم تین محرابوں والا مشہور ہارڈین گیٹ (Hardian Gate) ہے، جس کی مرمر کی خوبصورت محرابیں ابھی تک قائم کھڑی ہیں۔ یہ چودھویں صدی عیسوی میں بنایا گیا۔ شہر میں داخلے کا یہ سب سے بڑا گیٹ تھا۔

قدیم علاقے میں قدیم عالی شان مسجد کورکوٹ Korkut کے آثار بھی موجود ہیں۔ ابتدا میں یہ دوسری صدی عیسوی میں رومی عبادت گاہ تھی۔ جب عیسائیت کا اثر یہاں تک پہنچا تو اس کو بازنطینی چرچ بنا دیا گیا، پھر جب سلجوق ترکوں نے بازنطینی عیسائیوں کو شکست دے کر یہاں قبضہ کیا تو یہ چرچ مسلمانوں کی جامع مسجد میں تبدیل ہو گیا، صلیبی جنگوں کے زمانے میں اس کو دوبارہ چرچ بنا دیا گیا۔ جب عثمانی ترک یہاں قابض ہوئے تو اس عمارت کو مسجد بنا دیا گیا۔

سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہزاروں سال قبل بنائی گئی اور کئی اہم خوبصورت عمارتوں کے کچھ حصے ابھی تک موجود ہیں۔ کئی جگہوں پر عمارات ختم ہو چکی ہیں، لیکن سنگ مرمر کے عظیم الشان کالم دلکش نقش و نگار لیے قائم کھڑے ہیں۔

اناطولیہ کے نواح میں ساحل سمندر کے نزدیک ایک ایسی جگہ ہے، جہاں پتھریلی زمین سے ہر وقت آگ کے شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ اسے ابدی شعلہ (Eternal Flame) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانوں میں سمندری ملاح اس کی روشنی کو دیکھ کر رات کے وقت کشتی رانی کرتے تھے۔ یہ شعلے زیر زمین میتھائن گیسوں کے اخراج کی وجہ سے جلتے رہتے ہیں۔ آج کل سیاح اسے دیکھنے آتے ہیں تو شعلوں سے چائے اور کافی کے لیے پانی ابالا جاتا ہے۔

اناطولیہ میں میری رہائش ایک گیسٹ ہاؤس میں تھی۔ جس بس سے میں اناطولیہ پہنچا تھا اس میں میرے ساتھ ایک نوجوان یورپین جوڑا بھی سفر کر رہا تھا۔ لڑکا جس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی ہالینڈ سے تعلق رکھتا تھا، جب کہ لڑکی کا تعلق انگلینڈ سے تھا۔ بس میں سفر کے دوران میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ وہ کچھ دن قبل اناطولیہ میں رہ کر مرسین گئے تھے اب وہ دوبارہ اناطولیہ واپس آرہے تھے۔ وہ بھی ترکی میں سیاحت کے لیے آئے تھے۔ راستے میں انھوں نے بتایا کہ وہ اناطولیہ کو مرکزی مقام مقرر کر کے اردگرد کے علاقوں میں تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے جاتے تھے۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ اناطولیہ میں ایک بہت اچھے مہمان خانے (گیسٹ ہاؤس) میں رہتے تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ میں بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں رہوں۔ میں نے فوراً حامی بھر لی کیوں

کہ اس طرح میرا وقت بچ جائے گا، جو وقت ٹیکسی میں مناسب جگہ پر ہوٹل ڈھونڈنے میں لگتا ہے۔

یہ مہمان خانہ ایک بہت بڑا بنگلہ تھا، جس کے ارد گرد خوبصورت باغیچہ بھی تھا مالک مکان بھی وہیں رہتے تھے اور چار پانچ کمرے وہ روزانہ کرایہ کی بنیاد پر دیتے تھے۔ میرے ساتھیوں نے مالک مکان خاتون سے میرا تعارف کرایا۔ وہاں ان کا جواں سال بیٹا، حسن بھی مجھ سے ملا جو کسی کالج کا طالب علم تھا۔

مالک مکان خاتون کو جب پتا لگا کہ میں پاکستانی ہوں تو بے حد خوش ہوئی۔ انھوں نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ اس کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلی دفعہ کسی پاکستانی سے مل رہی تھیں۔ ان کے بیٹے نے بھی مجھ سے ملنے پر خوشی کا اظہار کیا۔ خاتون خانہ فوراً میری خاطر مدارت میں لگ گئیں۔

انھوں نے مکان کا سب سے اچھا کمرہ جس کی کھڑکی باغیچہ میں کھلتی تھی میرے لیے تیار کر دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے اعلان کر دیا کہ ان کے ہاں ایک پاکستانی کے آنے کی خوشی میں میرے لیے اور دیگر مہمانوں کے لیے شام کی چائے کی دعوت ان کی طرف سے ہوگی۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ یورپین حیران ہو رہے ہوں گے کہ ایک پاکستانی کے لیے یہ خصوصی آؤ بھگت کیوں ہو رہی تھی، مگر انھیں کیا معلوم کہ پاکستان اور ترکی کے درمیان کتنے گہرے اور بے لوث تعلقات ہیں۔

چائے کا انتظام گھر کے خوبصورت باغیچہ میں کر دیا گیا۔ ہمارے اوپر خوبصورت بیلیں لٹک رہی تھیں۔ ان میں بحر روم کی آب و ہوا کے مشہور مالٹوں کی بیلیں بھی تھیں جن پر خوبصورت سرخ رنگ کے سنگترے لٹکے ہوئے عجیب سماں باندھ رہے تھے۔ مالٹوں کی ایسی بیلیں میں نے زندگی میں پہلی دفعہ دیکھی تھیں۔ ورنہ تو یہ فروٹ ہمارے ہاں ایک جھاڑی جیسے چھوٹے درخت پر اگتا ہے۔

چائے کے ساتھ ترکی کی مخصوص مٹھائیاں بھی رکھی گئی تھیں، جن میں سب سے مزیدار مٹھائی وہ تھی، جس کا نام بلبل یواسا تھا یعنی بلبل کا گھونسلہ۔ پتلی سویوں سے ایک گھونسلے کی شکل کی پیالی جیسی بنائی گئی تھی، جس میں شکر پارہ قسم کی مٹھائی اور پستہ بھرا گیا تھا۔

ابھی چائے کا دور چل رہا تھا کہ وہاں ایک تیز طرار خوبصورت گوری لڑکی آ گئی۔ میرے ساتھی یورپین مہمان اسکو پہلے سے جانتے تھے، کیوں کہ وہ بھی اس گیسٹ ہاؤس میں رہ رہی تھی۔ اس لڑکی کا نام جینٹ (Janet) تھا۔ یورپین جوڑے نے میرا تعارف اس لڑکی سے کرایا۔ وہ لڑکی امریکن تھی۔ جیسا کہ امریکی ہوتے ہیں وہ لڑکی فوراً بے تکلف ہوگئی اور اس نے مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر مجھے خوش آمدید کہا

اس نے بتایا کہ وہ اناطولیہ میں کسی تعلیمی ادارے میں ترکوں کو انگریزی زبان سکھانے کا کام کرتی تھی۔

جینٹ ایسی باتونی لڑکی تھی کہ وہ کسی اور کو بولنے کا موقع ہی نہ دیتی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے شکایتاً کہا کہ ترک لوگ بڑے شکی مزاج لوگ ہیں اور ان میں سے اکثر یہ سمجھتے تھے، وہ ان کے ملک میں ایک جاسوس ایجنٹ ہے اور غالباً امریکہ کی خفیہ تنظیم سی آئی اے کی ایجنٹ ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ ترکوں کا یہ شک بلاوجہ بھی نہیں لگتا۔ ایک خوبصورت جوان لڑکی کا ایک اجنبی ملک کے دور دراز علاقے میں اکیلا رہنا قدرتی طور پر اسے مشکوک بنانے کے لیے کافی تھا۔ بہرحال جینٹ کی خوش مزاجی ماحول کو بے تکلف اور خوش گوار بنائے رکھتی تھی۔

چائے پینے کے بعد میں شہر کی سیر اور رات کے کھانے کے لیے اکیلا ہی چلا گیا۔ ترکی میں میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ میں وہاں کے ایسے ریسٹورانٹ میں وہاں کا دیسی کھانا کھاؤں جسے مقامی لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ جہاں مقامی لوگ کثیر تعداد میں کھانے کھاتے ہیں، وہاں کھانا لذیذ اور تازہ ہوتا ہے۔

اناطولیہ کی بڑی مرکزی سڑک پر میں نے ایک پولیس اہلکار سے انگریزی میں پوچھا کہ دیسی کھانے کا ریسٹورنٹ کہاں ہے، لیکن اسے میری انگریزی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے آخری حربے کے طور پر سوالیہ انداز میں پوچھا ''لوکانتا؟'' لوکانتا ریسٹورنٹ کو کہتے ہیں اس نے میرا سوال سمجھتے ہوئے ایک چھوٹی سڑک کی طرف اشارہ کر دیا۔

تھوڑی ہی دور وہاں ایک دیسی قسم کا ریسٹورانٹ تھا جو ترک گاہوں سے بھرا پڑا تھا۔

ریسٹورانٹ میں جا کر معلوم ہوا کہ وہ باربکیو (Barbacue) ریسٹورانٹ تھا، جہاں تکے کباب پیش کئے جا رہے تھے۔ ترکی میں عام طور پر بکرے یا دنبے کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

وہاں دس بارہ فٹ لمبی کوئلے والی انگیٹھیوں پر تکے کباب سینکے جا رہے تھے۔ ایک طرف کباب بنانے والے تھے دوسری طرف ساتھ ساتھ ملی کرسیوں پر گاہک بیٹھے تھے انگیٹھی کا گاہکوں کی طرف والا حصہ بڑھا ہوا تھا، جس پر تازہ تازہ تکے کباب گاہوں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے۔ انگیٹھی کا بڑھا ہوا حصہ گاہکوں کے لیے میز کا کام دے رہا تھا۔

مجھے وہاں کوئی خالی کرسی نظر نہ آئی۔ البتہ کباب بنانے والے نے اشارے سے بتایا کہ ایک کرسی خالی تھی۔ میں سکڑ کر دو گاہوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ میں نے جب کباب بنانے والے کو کباب کا

آرڈر دیا تو میری اجنبی زبان سن کر میرے دونوں طرف بیٹھے ہوئے ترک چونک سے گئے۔ میری دائیں طرف والے نوجوان نے پوچھا ''مملکت؟'' میں نے جواباً کہا ''پاکستان'' اس نے فوراً اپنی پلیٹ اٹھا کر میرے سامنے رکھ دی، جس میں تکے اور کباب تھے۔ اس نے اصرار کیا کہ جب تک میرا آرڈر کیا ہوا کھانا نہیں آتا میں اس کی پلیٹ سے کھاؤں ساتھ ہی اس نے ایک گلاس منگوا کر اس میں دیسی قسم کی بیئر جیسی شراب ڈال دی جو شکل میں پانی کی طرح ہوتی ہے اور جب اس میں پانی ملایا جائے تو دودھیا قسم کی ہو جاتی ہے، میرے سامنے رکھ دی میں نے تشکر کہتے ہوئے اس کی پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میرے بائیں طرف بیٹھے ہوئے ترک نے بھی اپنی پلیٹ میری طرف بڑھائی، جسے میں نے شکریے سے منع کر دیا۔ ترک بھائیوں کا یہ بے مثال اور بے ساختہ خلوص میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

رات گئے، جب میں اپنے گیسٹ ہاؤس واپس آیا تو یورپین جوڑا اور امریکی لڑکی جینٹ بھی کھانا کھا کر واپس آ چکے تھے اور کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ میزبان خاتون بھی آ کر ساتھ بیٹھ گئیں اور انھوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے میرے لیے کھانا رکھا ہوا تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ میرے لیے کافی لے آئیں اور ہم رات دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔

دوسرے دن صبح ہم سب مہمان باغ کی بیلوں کے نیچے چنے گئے بھرپور ناشتے پر جمع ہوئے۔ دن کی چمکیلی روشنی میں باغ کے درخت اور پھول بے حد خوبصورت لگ رہے تھے۔ میزبان خاتون اور ان کا بیٹا حسن بھی ہمارے ساتھ آ گئے۔ مہمان اور ترک میزبان ایک کنبے کی طرح لگ رہے تھے۔ ایسا ماحول کسی بڑے سے بڑے پانچ یا چھ ستاروں والے ہوٹل میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

دو دن قیام کرنے بعد مجھے احساس ہوا کہ مجھے اناطولیہ میں زیادہ دن رہنا چاہیے تھا۔ ایک تو یہاں تاریخی اہمیت کے اتنے مقام تھے کہ ان کے لیے دو ہفتے بھی کم تھے دوسرا یہ جگہ بے حد پرسکون اور خوبصورت ساحل پر چھٹیاں گزارنے کے لیے آئیڈیل تھی، مگر میرے پاس وقت کی کمی تھی اور ابھی مجھے ازمیر پہنچ کر اس کے اردگرد انتہائی اہم مقامات کی سیر کرنا تھی۔

ازمیر

ازمیر اناطولیہ کے مغرب کا سب سے بڑا آخری شہر ہے۔ قدیم زمانے سے اس شہر کا نام سمرنا تھا، جسے 1930ء میں تبدیل کر کے ازمیر کر دیا گیا تھا۔

ازمیر کی تقریباً 3500 سال قبل مسیح سے لکھی ہوئی تاریخ ہے۔ اس کے بحیرہ روم کے تجارتی شہروں سے قدیم زمانے سے روابط رہے ہیں۔ یہ شہر اور اس کے ارد گرد کا علاقہ پندرھویں صدی عیسوی میں عثمانی ترکوں کے زیر اثر آ گیا۔ اس کے بعد سترھویں صدی عیسوی میں یہ ایک اہم بندرگاہ بن گیا۔ غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کے لیے یہ پسندیدہ شہر کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اناطولیہ سے ازمیر تک کا سفر خاصا طویل ہے۔ راستے میں جگہ جگہ تاریخی اہمیت کے کئی شہر اور قلعے پڑتے ہیں۔ راستے میں الانیا کا عظیم الشان تاریخی قلعہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، پھر اسی راستے میں وہ مشہور غار بھی پڑتی ہے، جس کے اندر جا کر دمہ کے مریضوں کو افاقہ ہوتا ہے، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں سب چیزوں کو نہ دیکھ سکا۔

ازمیر کے لیے ترکوں اور یونانیوں کے درمیان کئی خونریز جنگیں ہو چکی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یونان نے انگریزوں اور اتحادی طاقتوں کے تعاون سے ازمیر اور مغربی اناطولیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ مگر مصطفیٰ کمال پاشا (اتاترک) کی بے مثال قیادت میں ترکوں نے انتہائی بہادری سے لڑ کر ازمیر اور ملحقہ علاقوں سے یونانیوں کو نکال باہر کیا تھا۔

ازمیر سے تھوڑے فاصلے پر بے انتہا اہمیت کے حامل مقامات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں یونانیوں کے زمانے کا عظیم الشان شہر افسس (Ephesis)، اصحاب کہف کی غار حضرت مریمؑ کی

آخری آرام گاہ سلجوقوں کا تاریخی قلعہ اور عظیم اور خوبصورت مساجد جیسے اہم مقامات ہیں۔

ازمیر پہنچ کر میں نے اپنے ہوٹل کی انتظامیہ سے کہا کہ اگر ارد گرد کی اہم تاریخی اور مذہبی مقامات کو دکھانے کے لیے کوئی سیاحتی کمپنی ہو تو میرا ان سے رابطہ کرا دیں۔ تھوڑی دیر میں ایک ایسی کمپنی کا ایک کارندہ میرے ہوٹل آیا اور اگلے دن کے لیے میرے سیاحتی سفر کا پروگرام طے ہو گیا۔ اگلے دن میں جلد تیار ہو کر ہوٹل کی لابی میں پہنچ کر انتظار کرنے لگا کہ وہ سیاحتی کمپنی کے لوگ آکر مجھے لے جائیں، مگر وقت مقررہ پر کوئی نہ پہنچا۔

تھوڑی دیر بعد سیاحتی کمپنی کا ایک اہم کارندہ آکر مجھ سے ملا۔ اس نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ کچھ ناگزیر وجوہ کی بنیاد پر وہ ٹور کینسل ہو گیا تھا، مگر وہ مجھے اپنی ذاتی کار میں لے کر بسوں کے اڈے تک چھوڑ آیا۔ اس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ سلجوق پہنچ کر مجھے کیا کیا دیکھنا چاہیے۔ میں نے اسے کچھ رقم دینا چاہی، لیکن اس نے کچھ لینے سے انکار کر دیا۔

سلجوق کے اڈے پر پہنچ کر میں نے ایک ادھیڑ عمر کے ٹیکسی ڈرائیور سے رابطہ کیا۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی جانتا تھا۔ میں نے ان تمام تاریخی جگہوں کو دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ان سب جگہوں پر لے جائے گا۔ چوں کہ وہ تجربہ کار ڈرائیور تھا اس لیے مجھے تسلی ہو گئی کہ وہ میرے لیے اچھا گائیڈ بھی ثابت ہو گا۔

افسس

سلجوق شہر سے روانہ ہو کر ہم تقریباً آدھے گھنٹے میں افسس پہنچ گئے۔ یہ ایجین Aegen سمندر پر دریائے کیسز کے ڈیلٹا کے دہانے پر ایک قدیم شہر ہے۔ زمانہ قدیم میں افسس ایک بہت بڑی بندرگاہ تھی۔ بعد میں جغرافیائی تبدیلیوں بالخصوص دریا کے ڈیلٹا میں بڑے پیمانے میں مٹی کے بھر جانے سے سمندر سے دریا کے ذریعے بندرگاہ تک بحری جہازوں کا پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ اس وجہ سے افسس کی تجارتی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔ اس طرح یہ سلیقے سے بنا ہوا قدیم شہر آہستہ آہستہ ویران ہوتا چلا گیا۔ اس وقت یہ شہر اپنی قدامت کی وجہ سے صرف سیاحت کے نکتہ نظر سے پرکشش جگہ ہے۔

افسس کا قدیم یونانی شہر اور اس کا اہم عجوبہ اس کا مشہور معبد جو اس زمانے کی مشہور دیوی ڈائنا کے نام پر Temple of Diana، 60 قبل مسیح میں بنایا گیا تھا۔ دیوی ڈائینا کو قدیم حوالوں میں شکار کی دیوی کہا جاتا تھا۔ ڈائینا کے معبد میں دور دور سے لوگ آیا کرتے تھے۔ اس کی خوبصورت اور عظمت کا شہرہ یورپ تک پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ دور میں یہ عظیم معبد بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اس وقت صرف اس کی بنیادیں اور سنگ مرمر کے خوبصورت ستون باقی رہ گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب عیسائیوں کے بڑے رہنما سینٹ پال (St. Paul) نے یہاں آکر عیسائیت کی تبلیغ شروع کی تو اس معبد کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔

اس شہر کو 412ء قبل مسیح میں ایرانی بادشاہ سائیرس نے فتح کیا تھا۔ بعد میں 133ء قبل مسیح میں اسکندر اعظم نے اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد یہ سلطنت روم کے تحت چلا گیا۔ 262ء میں یورپ کے نیم تہذیب یافتہ گوتھ (Goths) قبائل نے اس شہر کو بیدردی سے تباہ کر دیا۔

مسلمان سلجوقیوں نے اس شہر اور اس کے اردگرد علاقوں کو 1090ء میں فتح کر لیا۔ انھوں نے

افسس کے قدیم شہر کے نزدیک نیا شہر آباد کیا۔ اس نئے شہر کا نام سلجوق ہے۔

افسس میں ایک اہم عمارت، جس کے دو منزلہ ڈھانچے کا سامنے والا حصہ کھڑا ہوا ہے وہ عظیم الشان لائبریری تھی، جس میں ایک روایت کے مطابق تقریباً پندرہ ہزار طومار (Scrable) کتابیں ہوا کرتی تھیں۔

قدیم افسس میں رومن طرز کا ایک بہت بڑا تھیٹر بڑی حد تک موجود ہے، جس میں پچیس ہزار لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ اسی طرح ایک بڑے سے چوک میں قدیم زمانے کی درجنوں کی تعداد میں دکانوں کے آثار موجود ہیں۔ یہ دکانیں قدیم بندرگاہ کے قریب واقع تھیں، لیکن اس وقت یہ کھنڈروں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔

اس قدیم دلچسپ شہر کو دیکھنے کے لیے تقریباً دو گھنٹے لگے اور ایک کلومیٹر سے زیادہ چلنا پڑا۔ وہاں قدیم حمام کے کمرے بھی کس حد تک باقی اور دیکھنے کے قابل ہیں۔ ان تمام چیزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شہر اصلی حالت میں کس قدر شان دار ہوگا۔ افسس میں میرے ساتھ ہی ایک عمر رسیدہ امریکن جوڑا بھی چل رہا تھا۔ ان کے پاس اس شہر کے بارے میں کچھ ایسے پمفلٹ تھے، جن میں ہر چیز تفصیل سے درج تھی۔ ان کے کہنے پر میں نے ان کے ساتھ تقریباً ایک کلومیٹر چل کر افسس کی سیر حاصل سیر کی۔ ان کے علاوہ خاصی بڑی تعداد میں اور گورے سیاح بھی اس شہر خموشاں کو دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ صحیح معنوں میں سیاحوں کی جنت کا درجہ رکھنے والا شہر ہے، جہاں شہر کی عمارتوں اور گلیوں کے فرشوں میں بھی سنگ مرمر بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے۔

زمانہ قدیم میں افسس بت پرستی اور جادوگری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس کاروبار میں یہودیوں کا بھی اچھا خاصا حصہ تھا۔ یہ لوگ اپنے فن کو حضرت سلمانؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

یہاں کا عظیم الشان مندر یا معبد جس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی دنیا کے سات عجوبوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ آرٹمس (Artemis) کا معبد بھی کہلاتا تھا۔ یہ 401ء میں مکمل تباہی سے پہلے تین دفعہ از سر نو تعمیر ہو چکا تھا۔ ساتویں صدی قبل میں تو اس کا سب سے پرانا معبد اور شہر ایک عظیم سیلاب کی وجہ سے تباہ ہوا۔ انھیں دوبارہ تعمیر کرنے میں دس سال لگ گئے تھے۔ بعد میں رومی بادشاہ ہیروسٹرائٹس (Herostratus) نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے بعد اس کی ایک بار پھر تعمیر ہوئی۔

کی نشان دہی کی حالاں کہ انھوں نے کہیں بھی کوئی سفر اختیار نہیں کیا تھا۔ انھوں نے نیم خوابی کی حالت میں دیکھا تھا کہ حضرت مریمؑ سینٹ جان کے ساتھ یروشلم سے افسس کی طرف سفر کر رہی تھیں۔ سسٹر این نے اپنے بستر پر لیٹے لیٹے ہی حضرت مریمؑ کے گھر کی تمام تفصیلات بتا دی تھیں، جن کے نزدیک بیٹھے ہوئے دانش ور شاعر برنیٹو (Brenteno) نے اپنی ڈائری میں لکھ لیا تھا۔

سسٹر این کیتھرین نے حضرت مریمؑ کا مستطیلی طرز کے پتھروں سے بنے ہوئے اس گھر کو خاصی تفصیل سے بیان کر دیا تھا۔ اس گھر کو ان کے لیے سینٹ جان نے بنایا تھا۔ انھوں نے گھر کے اندر آتش دانی اور کمرے کی پچھلی دیوار کی گولائی بھی بنا دی تھی۔

اس معذور جرمن نن نے غنودگی میں اور چیزوں کے علاوہ حضرت مریمؑ کے گھر کے ساتھ پانی کے ایک چشمے کی موجودگی کو بھی بیان کر دیا تھا۔

سسٹر کیتھرین نے یہ بھی بتایا کہ حضرت مریمؑ کا انتقال چونسٹھ سال کی عمر میں ہوا تھا اور انؑ کو انؑ کے گھر کے نزدیک ایک غار میں دفنا دیا گیا تھا، مگر تھوڑے عرصہ بعد جب ان کا کفن کھولا گیا تو انؑ کا جسم مبارک غائب تھا۔ اس کے بعد ان کے گھر کو چرچ بنا دیا گیا۔

اس کے کئی سالوں بعد ایک فرانسیسی پادری گوئے (Goyet) نے جرمن دانش ور برینٹانو کے مسودے میں سسٹر این کیتھرین کے خواب کا ذکر پڑھا تو وہ حضرت مریمؑ کا گھر ڈھونڈنے کے لیے افسس آیا۔ بالآخر اس نے وہ گھر ڈھونڈ لیا، جس کی تفصیل سسٹر کیتھرین نے بتائی تھی۔ اس کے بعد اس نے پیرس اور روم کے بشپ پادریوں کو حضرت مریمؑ کے گھر کے متعلق اطلاع دی، لیکن انھوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔

بعد میں 1892ء میں متعدد پادری اور ماہرین آثار قدیمہ اس مقام پر بھیجے گئے، جنھوں نے اس گھر کی تصدیق کی۔ اس وقت سے یہ کیتھولک فرقے کے عیسائیوں کی زیارت گاہ ہے۔ ترکی زبان میں حضرت مریمؑ مریما (مریم ماں) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے بعد 1897ء میں اس گھر کے نزدیک ہی یہاں آنے والے زائرین کے لیے ایک آرام گاہ بھی بنا دی گئی۔ بعد میں پوپ پال ششم اور پوپ جان دوئم بھی یہاں آئے۔ انھوں نے بھی اس جگہ کو حضرت مریمؑ کا گھر تسلیم کر لیا۔

اس وقت سے اس جگہ پر عبادت اور دعا کے لیے بڑے بڑے اجتماعات ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں روزانہ کی بنیاد پر بھی دعا کی جاتی ہے۔

چوں کہ حضرت مریمؑ مسلمانوں کے لیے بھی مقدس اور محترم ہیں اس لیے مقامی مسلمان بھی عیسائیوں کے

حضرت مریمؑ کے گھر آ کر دعائیں اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

میں جس وقت حضرت مریمؑ کے گھر کی زیارت کے لیے پہنچا تو اس وقت وہاں یورپین اور امریکی سیاحوں کا ایک ہجوم سا وہاں موجود تھا۔ گورے مرد اور خواتین حضرت مریمؑ کے گھر کے اندر اور باہر آ جا رہے تھے۔ میں بھی گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ سادہ سی پتھروں سے بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت ہے، جس کا کوئی گنبد نہیں ہے۔ حضرت مریمؑ کے گھر کو انگریزی صرف ٹی (T) سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ دائیں طرف انؑ کے سونے کا کمرہ ہے۔ بائیں طرف سے ان کا باورچی خانہ ہے۔ مرکزی جگہ پر پچھلی گولائی والی دیوار کے ساتھ حضرت مریمؑ کا مجسمہ بنایا گیا ہے۔

میں نے حضرت مریمؑ کے مجسمے کی مخالف سمت خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے فاتحہ پڑھا اور اسی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ وہاں موجود عیسائی سیاح مجھے بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کر رہا تھا۔

فاتحہ پڑھنے کے بعد جب میں حضرت مریم کے مکان سے باہر آیا تو ایک عمر رسیدہ امریکی جوڑا میرے قرب آیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہاتھ اٹھا کر میں کیا کر رہا تھا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں دعا پڑھ رہا تھا، جس طرح کہ مسلمان عام طور پر کرتے ہیں۔ جب وہ کسی روحانی اور قابل تکریم شخصیت کے مزار پر جاتے ہیں۔ انھیں حیرت ہوئی کہ مسلمان بھی حضرت مریمؑ کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں! ہمارے لیے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ باعث عزت و تکریم ہیں اور جب تک ہم حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا پیغمبر اور کنواری حضرت مریمؑ پر ایمان نہ لائیں، ہم مسلمان نہیں ہو سکتے۔ مجھے محسوس ہوا کہ انھیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک مسلمان کے منہ سے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی شان میں اتنی اچھی باتیں نکل رہی تھیں۔

مغرب میں عام عیسائیوں کا یہ خیال ہے کہ مسلمان نعوذ باللہ ان کو نہ تو مانتے ہیں اور نہ ہی ان کی عزت کرتے ہیں، حالاں کہ یہ تو یہودیوں کا وطیرہ رہا ہے۔

میں نے ان امریکی سیاحوں کو بتایا کہ جہاں تک حضرت مریمؑ کے مجسمے کے مخالف سمت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ہے تو ہم مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ کسی بت یا مجسمے کو نہ پوجیں اور نہ ہی اس کی طرف منہ کر کے دعا مانگیں۔

مغرب کے عیسائیوں کو اسلام اور مسلمانوں کے اعتقاد کے متعلق اول تو کوئی علم نہیں ہے اور اگر کچھ علم ہے تو غلط اور اسلام دشمنی پر مبنی ہے۔ ان پر اسلام دشمن میڈیا چھایا ہوا ہے۔

حضرت مریمؑ کے مکان پر ہر سال 15 اگست کے دن کیتھولک اور کٹر (Orthodex) عیسائی قائدین کے ساتھ مسلمان علما بھی اکٹھے ہو کر دعا کی رسم ادا کرتے ہیں۔ اس قسم کی تقریب غالباً دنیا میں اور کہیں نہیں ہوتی۔

حضرت مریم کے گھر کے قریب میں واقع چشمے کے پانی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ معجزانہ طور پر کئی بیماریوں کے لیے علاج کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت مریمؑ کے مقبرے سے نکل کر ہم قریب میں واقع سلجوق شہر میں رک گئے، جہاں میں نے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا، پھر وہاں سے میں نزدیک ہی واقع ایک عجائب گھر میں چلا گیا۔

اور باتوں کے علاوہ میں چاہ رہا تھا کہ حضرت مریمؑ کے مقبرے اور دیگر مقامات سے متعلق مزید معلومات حاصل کر سکوں۔ اس کے علاوہ چوں کہ میری اگلی منزل اصحاب کہف کی غار کی زیارت تھی، اس معاملے میں مجھے خیال تھا کہ کچھ معلومات پیشگی مل جائیں گی۔ عجائب گھر میں اور انتہائی دلچسپ چیزوں کے علاوہ مجھے اصحاب کہف جنھیں سیون سلیپرز (Seven Sleepers) کہتے ہیں کے نام ایک فریم میں لکھے ہوئے مل گئے جو میں نے لکھ کر اپنے پاس رکھ لیے۔

اصحاب کہف

قدیم تاریخی شہر افسس اور نئے شہر سلجوق کے قریب چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا وہ سلسلہ ہے، جہاں ایک ایسی پہاڑی ہے، جس میں قدیم رومی حکومت کے زمانے میں اہل ایمان نوجوانوں نے اس وقت کی کافر حکومت کے جبر و استبداد سے بچنے کے لیے چھپ کر پناہ لی تھی۔ اس غار میں وہ معجزاتی طور پر تین سو سال تک سوئے رہے تھے۔

اس واقعہ کو قرآن کریم میں سورۃ الکہف میں بیان کیا گیا ہے جو مکی دور کی سورۃ ہے، جس وقت مکہ میں مسلمانوں پر مشرکین مکہ کی طرف سے بے انتہا ظلم ڈھائے جا رہے تھے، اس وقت مسلمانوں کی ڈھارس بندھانے کے لیے وحی کے ذریعے اصحاب کہف کا قصہ بیان کیا گیا۔ اصحاب کہف کے ساتھ ان کا وفادار کتا بھی تھا۔ عیسائیوں کے قصے میں اس کتے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

یہ قصہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اصحاب کہف بھی اسی توحید کے قائل تھے، جس کی دعوت قرآن پیش کرتا ہے۔ یہ قصہ آخرت کی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ جس طرح ان مواحد جوانوں کو لمبے عرصے تک موت کی نیند سلا کر پھر جلد اٹھایا تھا اسی طرح بعث بعد الموت کی حقیقت ہے۔

اس قصے کی شہادت زمانہ قدیم میں ایک عیسائی پادری، جس میں سروجی کے 474ء کے وعظوں میں پائی جاتی ہے۔ ابن کو اب جریر طبری نے اپنی تفسیر میں بھی لکھا ہے۔ مشہور مورخ گبن نے اس واقعے کو ''سات سونے والے'' (Seven Sleepers) کے قصے کے طور پر لکھا کہ انھوں نے سنگساری یا مرتد ہونے سے بچنے کے لیے غار میں پناہ لی تھی۔ اس وقت قیصر ڈیئس (Decius) کا زمانہ تھا۔ جب اصحاب کہف زندہ ہوئے اس وقت رومی بادشاہ اور اس کی سلطنت نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ اس وقت

کا بادشاہ تھیوڈوسس رومی (Theodosus) تھا۔ اس واقعے کی سب سے زیادہ تشہیر مغربی ممالک میں جیکوس ورجین (Jacolus Vorgine) نے ''کتاب ''سنہری داستان'' (Golden Legend) میں کی۔

جاگنے کے بعد اصحاب کہف نے، جس ساتھی کو کھانا لانے کے لیے بھیجا تھا گبن نے اس کا نام جیمبلیس (Jamlehus) لکھا ہے، جو قدیم سکے لے کر کھانا لینے گیا اور قدیم سکوں کی وجہ سے یہ عقدہ کھلا کہ یہ لوگ تین سو سال تک اس غار میں سوئے رہے تھے۔ ان کے سونے کا عرصہ شمسی کیلنڈر کی رو سے 300 سال بنتا ہے، جب کہ قمری کلینڈر کے مطابق 309 سال بنتا ہے۔ دونوں کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔

مشہور عالمی سکالر علامہ اسد (Leopold Weiss) سورۃ الکہف کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اصحاب کہف کا قصہ حضرت عیسیٰ کے زمانے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ان کے بقول مدینہ میں یہودی علما نے کفار مکہ کو سکھایا تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کا امتحان لینے کے لیے اصحاب کہف کے متعلق سوالات کریں۔

علامہ اسد کے بقول یہودیوں نے تو پہلے ہی سے عیسائیوں سے قطع تعلق کیا ہوا تھا۔ لہٰذا ان کے بقول یہ سات سونے والے یہودی تھے، جن کے قصے کو مدینہ کے یہودیوں علما نے محفوظ رکھا ہوا تھا۔

بہرحال سلجوق کے نزدیک اصحاب کہف کی غار کو دیکھ کر عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ میرے ڈرائیور نے مجھے غار سے کچھ پہلے سڑک پر اتار دیا اور میں تقریباً نصف کلومیٹر پہاڑیوں میں پیدل چل کر اس غار کے دہانے تک پہنچا۔

اصحاب کہف کی غار کے اوپر یا اس کے نزدیک اس وقت کوئی عمارت نہیں ہے، البتہ غار کے اندر کچھ معمولی قسم کی تعمیرات کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔

جب میں اس غار تک پہنچا تو میں اکیلا تھا اردگرد بالکل خاموشی تھی، جس سے اندازہ ہوتا ہے۔ اصحاب کہف نے صحیح طور پر اس غار کا انتخاب کیا تھا۔ غار کے اوپر جو عبادت گاہ بنائی گئی تھی وہ کافی عرصے سے زمین بوس ہو چکی تھی، البتہ اس کی بنیادیں 1928ء 1927ء میں دریافت کی گئی تھیں۔ کھدائی کے دوران پانچویں اور چھٹی عیسوی صدی کے زمانے کے سیکڑوں قبروں کے آثار بھی نکلے تھے اور صحاب کہف کی شان میں کچھ تحریریں کھنڈر شدہ معبد کی دیواروں اور کچھ قبروں پر لکھے ہوئے پائے گئے تھے۔

میں تھوڑی دیر اصحاب کہف کی غار کے اردگرد کی پہاڑیوں پر گھومتا پھرتا رہا اور اس زمانے کے ماحول کو اپنے تصور میں لاتا رہا۔ معاً مجھے اپنے ٹیکسی ڈرائیور اور گائیڈ کا خیال آیا جو پکی سڑک پر میرا انتظار کر رہا تھا، چنانچہ میں تیزی سے واپس چل پڑا۔ راستے میں مجھے دو تین گورے سیاح غار کی طرف جاتے نظر آئے۔

ازمیر کی نمائش

سلجوق میں ایک رات گزارنے کے بعد میں ازمیر آ گیا۔ ارادہ تھا کہ ایک دن وہاں رہ کر ملک واپسی کے لیے استنبول چلا جاؤں گا۔

ازمیر پہنچ کر میں اس ہوٹل میں گیا، جہاں سلجوق جانے سے پہلے میں رہ چکا تھا۔ ہوٹل والوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ان کا پورا ہوٹل بک تھا اور کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ اس لیے میرے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ازمیر میں مشہور زمانہ بین الاقوامی نمائش کا آغاز ہو چکا تھا اور تمام ہوٹل مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔

میں نے ہوٹل والوں سے کہا کہ میرا سامان ہوٹل کی لابی میں رکھ لیں تا کہ یہ کسی نزدیکی ہوٹل میں جا کر کمرہ ڈھونڈوں، وہاں سے نزدیک تین چار ہوٹلوں سے معلوم کیا تو وہاں بھی کوئی کمرہ خالی نہ ملا۔

چوں کہ وہاں سے ازمیر کی بین الاقوامی نمائش نزدیک تھی میں نے سوچا اس کو جلدی سے دیکھ لوں اور شام کو پھر کسی اور ہوٹل میں کمرے کی تلاش شروع کروں گا۔ ورنہ پھر رات والی کسی بس میں استنبول کے لیے روانہ ہو جاؤں گا اور صبح تک استنبول پہنچ جاؤں گا۔

ازمیر کی نمائش ایک بہت بڑے وسیع و عریض علاقے میں منعقد ہو رہی تھی۔ یہ علاقہ مستقل طور پر نمائش یا کوئی اور اہم تقریب کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

نمائش میں گھومتے پھرتے مجھے پاکستان کا پویلین نظر آ گیا۔ وہاں پویلین کے انچارج حکومت کے ڈائریکٹر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے انھیں ہوٹل میں کمرہ نہ ملنے کی بپتا سنائی۔

انھوں نے بتایا کہ ازمیر کی یہ نمائش ترکی کی سب سے بڑی نمائش ہوتی ہے۔ اس لیے ملک کے اندر سے اور بیرون ملک سے بڑی تعداد میں لوگ یہاں شرکت کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ہوٹلوں میں رہائشی جگہیں کم پڑ جاتی ہیں۔

اب میں نے پویلین میں لگائے گئے پاکستانی اسٹال دیکھنا شروع کر دیے۔ ایک اسٹال پر پاکستانی قالین اور دیگر دستکاری کی اشیا سجی ہوئی تھیں۔ اسٹال کے مالک اتفاق سے میرے شہر ملتان کے رہنے والے محمد فیروز تھے۔ ان سے علیک سلیک کے بعد جب میں نے ان سے اپنے لیے رہائش کے لیے کسی ہوٹل میں کمرہ نہ ملنے کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور یہ کہ وہ اپنے ہوٹل کے کمرے میں میرے لیے ایک مزید بیڈ لگوا دیں گے۔ میں نے سوچا چلو ایک رات کے لیے تو مسئلہ حل ہو گیا۔

رہائش کے مسئلے سے بے فکر ہو کر میں نے دوسرے اسٹال دیکھنے شروع کر دیے۔

ایک چھوٹے سے اسٹال پر کاسمیٹک اور خوشبویات وغیرہ کی نمائش تھی۔ وہاں ایک ترک نوجوان انچارج تھے، وہاں کی مصنوعات ترکی ہی کی بنی ہوئی تھیں۔ میں نے ان میں دلچسپی لینا شروع کر دی تو انچارج نوجوان نے میری شہریت دریافت کی۔ میں نے بتایا کہ میں پاکستانی ہوں۔ اس پر اس نے گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے بطور خاص خوش آمدید کہا۔ میں نے بھی مناسب الفاظ میں دوستانہ خیالات کا اظہار کیا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ یہ نوجوان کچھ عرصہ لندن میں بھی رہ چکے تھے اس لیے اچھی خاصی انگریزی بول لیتے تھے۔

میں نے وہاں ایک خوشبو پسند کی اور اس کی قیمت دریافت کی۔ انھوں نے قیمت بتانے کے بہ جائے اس کو ایک تھیلی میں ڈال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک ترک کی طرف سے پاکستانی بھائی کے لیے تحفہ ہے۔ میں نے کہا کہ میں یہ تحفہ نہیں لے سکتا۔ میں خریدنا چاہتا ہوں، مگر وہ کسی طرح نہ مانے اور اصرار کیا کہ میں ان کا دل رکھنے کے لیے تحفہ قبول کر لوں۔ اس پر میں نے مجبور ہو کر پرخلوص تحفہ قبول کر لیا۔

میرے تحفہ دینے والے دوست کا نام عشکن یزیجی تھا اور ان کا آبائی گھر استنبول میں تھا۔ میں نے انھیں بتایا کہ پاکستان جانے سے پہلے میں تین چار دن استنبول میں رکوں گا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ازمیر کی نمائش کے خاتمے پر وہ مجھے استنبول میں ملیں گے۔ ازمیر کی بین الاقوامی نمائش میں سب سے زیادہ

شرکت جرمنی کی لگتی تھی۔ ترکی اور جرمنی پہلی جنگ عظیم میں اتحادی رہ چکے تھے اور کئی جرمن فوجی اور افسر ترکوں کے شانہ بہ شانہ انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے تھے۔

آج کل بھی یورپ میں ترکی کے اقتصادی تعلقات سب سے زیادہ جرمنی سے ہیں۔ اس وقت جرمنی میں غیر ملکی اشخاص میں ترکوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

جرمنی کی سیر و سیاحت کے دوران مجھے ترکوں کے ریسٹورانٹ خاصی بڑی تعداد میں نظر آئے۔ ان میں، چوں کہ حلال گوشت استعمال ہوتا ہے اس لیے نہ صرف ترک، بلکہ دیگر ممالک کے مسلمان بھی وہاں بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔

ازمیر کی نمائش میں اسرائیل کا پویلین بھی بہت نمایاں تھا۔ وہاں اسرائیل کے بنے ہوئے زرعی آلات اور مشینری وغیرہ بہت نمایاں تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ ترکی نے اپنے آپ کو سیاسی اور معاشی طور پر ترقی یافتہ بنانے کے لیے اپنے ماضی سے سبق سیکھ کر بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ترکی یقیناً دیگر مسلمان ممالک کے لیے اچھی مثال قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

دن کا باقی حصہ میں نے ازمیر کے دیگر اہم مقامات کی سیر میں گزارا۔ وہاں شہر کے وسط میں ایک بہت بڑا خوبصورت پارک بھی ہے۔ وہاں میں نے انگوروں کی بیلوں کے سائے میں بیٹھ کر روایتی سماوار والی چائے پی اور پارک کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوا۔

اگلے دن میں استنبول کی طرف روانہ ہو گیا۔

استنبول واپسی

ازمیر سے استنبول واپسی پر ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی ایک عرصہ تک مہم جوئی کر کے گھر واپس لوٹ رہا ہو۔ ایسا تاثر کئی اور ملکوں میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً امریکہ میں مین ہٹن (نیویارک) اپنی گوناگوں دلچسپیوں کی وجہ سے اسی قسم کی کشش رکھتا ہے، جس طرح برطانیہ میں لندن کی اسی قسم کی چاہت ہوتی ہے۔

بس میں میرے برابر ایک ادھیڑ عمر کے چست و چوبند ترک بیٹھے تھے۔ بس چلنے کے تھوڑی دیر بعد ان سے ہلکی پھلکی بات چیت شروع ہوئی۔ وہ ترک فوج میں حاضر سروس کرنل تھے۔ ان کی پاکستان کے لیے گرمجوشی مثالی تھی۔ وہ ازمیر اور اردگرد کے علاقوں میں فوجی چھاؤنیوں کے معائنہ اور چھان بین کے لیے استنبول سے آئے ہوئے تھے۔ ان کی انگریزی خاصی صاف تھی اس لیے ان سے بات چیت میں آسانی تھی۔ اس سے میری تنہائی کے احساس میں خاصی کمی ہوئی۔

باتوں باتوں میں نے ان سے پوچھا کہ ترکی میں اتنے صوبے کیوں تھے۔ اس وقت ترکی کے صوبوں کی تعداد غالباً 72 یا 74 تھی۔ انھوں نے بتایا کہ دو دن پہلے ترکی کے صوبوں میں ایک اور صوبے کا اضافہ کردیا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ چوں کہ ملک کی آبادی میں خاصا اضافہ ہو رہا تھا اس لیے ضرورت محسوس کی گئی تھی کہ عوام کی سہولت کی خاطر ایک صوبے کا اور اضافہ کردیا جائے تاکہ حکومت عوام سے مزید قریب ہو جائے۔

دراصل صوبوں کی تعداد کا آبادی اور جغرافیائی ضروریات کے مطابق عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں پہنچانا ہوتا ہے تاکہ لوگوں کو اپنے روزمرہ کے مسائل کو حل کرنے کے لیے دور دراز سفر کر کے تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ اس طرح حکومتی من مانی کرنے، بدعنوانی اور رشوت کو روکنے میں مدد ملتی ہے۔

اس کے برعکس پاکستان میں مرکزیت کے حامل غلامی کے دور کا نوآبادیاتی نظام ابھی تک قائم ہے، جس کی وجہ سے حکومتوں کے آمرانہ اختیارات، رشوت، غبن اور دھاندلی کا دور دورہ ہے، جس کا شکار غریب عوام ہی ہوتے ہیں۔

تاکسیم اسکوائر

استنبول کا یہ مشہور میدان استنبول کے یورپی حصے میں واقع ہے، جہاں سیاح بطور خاص بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ اس کے اردگرد تفریح کے لیے متعدد دلچسپی کے مقامات بھی ہیں۔ اس کو استنبول کے دل کی حیثیت حاصل ہے۔

تاکسیم اسکوائر میں ترک جمہوریت کی وہ یادگار بنائی گئی ہے، جس میں مصطفیٰ کمال اتاترک اور ان کے ساتھیوں کے فوجی وردی میں مجسمے بنائے گئے ہیں۔ اس یادگار کے سامنے ایک کھلا میدان ہے جہاں جلسے منعقد ہوتے ہیں اور کبھی کبھی احتجاجی مظاہرے بھی یہیں ہوتے رہتے ہیں۔

تاکسیم اسکوائر ترکی کی 1923ء میں جمہوریہ کی بنیاد رکھنے کی پانچویں سالگرہ کے موقع پر 1928ء میں بنایا گیا تھا۔ یہ ترکی کی جنگ آزادی کی نشانی کے طور پر بنایا گیا اہم مقام ہے۔ اس چوک کا نام تاکسیم اسکوائر اس طرح پڑا کہ سلطان محمود اول کے زمانے میں استنبول کے شمال سے بڑی مقدار میں پانی اکٹھا کر کے شہر کے دوسرے علاقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

تاکسیم میدان میں ایک خوب صورت پارک بھی موجود ہے، جس کے کناروں پر خوب صورت درختوں کی قطاریں ہیں۔ اس کو تاکسیم غازی پاک کہا جاتا ہے۔

ایک دن جب میں تاکسیم میدان کی طرف گیا تو راستے میں استنبول کے تمام گھروں پر چاند ستارے والے سرخ رنگ کے جھنڈے تمام سرکاری عمارتوں بنکوں اور دیگر تمام عمارتوں پر لہرا رہے تھے۔ تاکسیم میدان بھی بے شمار قومی جھنڈوں سے پٹا پڑا تھا۔ یہ دن آزادی کی جنگ جیتنے کی یاد میں منایا جا رہا تھا۔ ہر طرف ترکی کے جھنڈوں کی اس قدر بہتات ترکوں کے جذبہ حریت کا جیتا جاگتا ثبوت

تھا۔ میں نے اس قسم کے جھنڈوں کی بہار اور قومی جوش وجذبہ کسی اور ملک میں نہیں دیکھا۔ پاکستان میں تو قومی جھنڈوں کی تعداد اور لوگوں کا باہر آ کر یوم آزادی منانے کا اگر ترکی موازنہ کیا جائے تو یہ ترکی کے مقابلے میں عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ ترکی میں قومی دن پر کسی ایسے گھر یا بلڈنگ جس پر قومی جھنڈا نہ لہرا رہا ہوں کو ڈھونڈنا تقریباً ناممکن ہونے کے برابر ہے۔ جب کہ پاکستان میں پاکستانی جھنڈوں کا لہرانا خال خال ہی ہوتا ہے۔ یہ پاکستانی قوم میں ترکی کے تناظر میں قومی جذبے کا مفقود ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

آج کل استنبول میں ذرائع آمدورفت کا مرکز تقسیم اسکوائر ہے۔ اس کے نزدیک ہی دنیا کی دوسری بڑی ٹرین (Subway) ہے۔ پہلے نمبر پر لندن کی سب وے ہے۔ تاکسیم میدان کے اردگرد بڑے بڑے ہوٹل، ریسٹورنٹ اور شاپنگ پلازے ہیں، جہاں ہر وقت بھیڑ بھاڑ اور رونق لگی رہتی ہے۔ پبلک ٹرانسپورٹ کے لیے یہ مرکزی مقام ہے۔

گورنر صوبہ استنبول سے ملاقات

پاکستان روانگی سے تین دن قبل میں نے سوچا کہ دیکھا جائے کہ ترکی میں حکومت کا کاروبار کیسے چلتا ہے۔ اس کا ذکر میں نے عشکن یزیجی سے کیا۔ اس نے پوچھا کیا آپ صوبہ استنبول کے گورنر سے ملنا چاہیں گے۔ اس کا بھائی یا قریبی رشتے دار گورنر کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ میں نے سوچا یہ کس طرح ممکن ہے کہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے ایک صوبے کے گورنر سے جو خالی برائے نام سربراہ نہیں ہوتا بلکہ چیف ایگزیکٹو ہوتا ہے، سے بغیر پیشگی وقت مقرر کیے ملاقات ہو سکتی ہے! لیکن عشکن نے مجھے یقین دلایا کہ گورنر سے ملاقات کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

دوسرے دن صبح صبح ہی عشکن میرے ہوٹل آ گیا اور ہم گورنر صاحب سے ملنے چل پڑے۔ گورنر کا دفتر کسیم اسکوائر کے قریب تھا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ پیشگی وقت لیے بغیر گورنر سے ملاقات کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ اس خدشے کا ذکر میں نے عشکن سے بار بار کیا، لیکن ہر بار اس نے بڑے اعتماد سے مجھے یقین دلایا کہ اگر گورنر صاحب دفتر میں ہوں گے تو ملاقات ہو جائے گی۔

استنبول صوبے کے گورنر کا دفتر ایک تین منزلہ عمارت میں تھا۔ عمارت کے صدر دروازے پر صرف دو مسلح پہرے دار کھڑے تھے۔ عمارت کی وضع قطع ایک عام کاروباری علاقے کی عمارت کی طرح تھی۔ وہاں ہٹو بچو سر کار والا کوئی ماحول نہیں تھا، جیسا کہ پاکستان میں ہوتا ہے۔

عشکن یزیجی نے پہرہ داروں سے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ پاکستان سے

آئے ہیں اور وکیل ہیں یہ گورنر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں پہرہ داروں نے بغیر کسی تردد اور پوچھ گچھ کے دروازہ کھول دیا اور اوپر کی طرف اشارہ کیا، یعنی گورنر صاحب کا دفتر اوپر والی منزل پر تھا۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل پر پہنچے تو ایک دروازے پر گورنر صاحب کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ان کے کمرے کے سامنے صرف ایک چپڑاسی یا نائب قاصد کھڑا ہوا تھا۔ عشکن مجھے گورنر کے ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ وہاں پانچ چھ اہلکار بیٹھے کام میں مصروف تھے، جن میں عشکن کا بھائی بھی تھا، جس سے اس نے میرا تعارف کرایا۔ عشکن نے اسے بتایا کہ ہم گورنر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس نے ہمیں رکنے کو کہا اور گورنر کے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے اندر گورنر صاحب سے بات کی اور فوراً ہمارے پاس آ کر ہمیں گورنر صاحب کے کمرے میں لے گیا۔

گورنر صاحب ہمیں دیکھ کر ڈیسک سے اٹھ کر کمرے کے درمیان میں آ کر مجھ سے ملے اور گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ''ویلکم پاکستانی کاردیش''، یعنی پاکستانی بھائی خوش آمدید، پھر انھوں نے ہمیں اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا عشکن کا بھائی واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔

گورنر صاحب نے کہا کہ انھیں پاکستانی بھائیوں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے اور یہ کہ ترکی کو پاکستان سے دوستی پر فخر ہے۔

میں نے بھی ان کے جذبات کو سراہتے ہوئے ترک قوم اور پاکستانیوں کے آپس میں گہرے اور پرانے رشتوں اور مشترکہ اقدار کا ذکر کیا۔

انھوں نے بتایا کہ ایک صوبے (ولایت لاد) میں انتظامیہ کا سربراہ صرف گورنر ہوتا ہے گورنر ہی مرکز کا نمائندہ بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہنگامی حالات میں آئین گورنر کو اس قسم کے اختیارات تفویض کرتا ہے جو کہ مارشل لا کے اندر ہوتے ہیں۔

1995ء میں ترکی کو چھیتر صوبوں (ولایت لا) میں تقسیم کیا گیا۔ ہر صوبے میں اوسطاً آٹھ ضلع (Kazalar) ہیں۔ ہر ضلع کے اوسطاً 493 ذیلی یا سب ڈسٹرکٹ (بوجک لار Bucaklar) ہوتے ہیں۔

میرے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ ہر سب ڈسٹرکٹ (Subdistrict) کا انچارج ایک ڈائریکٹر ہوتا ہے ڈائریکٹروں کی مجموعی تعداد تقریباً چالیس ہزار 40,000 ہے۔ یہ ڈائریکٹر دیہات میں

قانون کے نافذ اور امن وامان قائم رکھنے کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔

ترکی میں مقامی حکومتوں کا بے حد کامیاب اور مربوط نظام قائم ہے۔ اس کا سب سے چھوٹا یونٹ گاؤں ہوتا ہے، جس کی آبادی 2000 نفوس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کا سربراہ، جسے مختار (Mahtar) کہتے ہیں، اسے گاؤں کی بالغ آبادی کی اسمبلی منتخب کرتی ہے۔ 2000 سے زیادہ کی آبادی پر میونسپل گورنمنٹ (بلدیہ Boledye!) ہوتی ہے۔ اس کے سربراہ (بلدیہ رئیس Belediya Reisi) کو مقامی لوگ پانچ سالوں کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ بلدیہ کی میونسپل کونسل بھی پانچ سالوں کے لیے منتخب ہوتی ہے، جس کے اختیارات میں رہایش علاقوں کی منصوبہ بندی، سڑکوں پانی اور نکاسی آب، جائیداد ٹیکس وغیرہ جیسی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔

دیہاتوں کی منتخب کونسلیں (Ikhtayar Meclisi) جن میں گاؤں کے سکول ٹیچر اور امام مسجد بھی شامل ہوتے ہیں، گاؤں کے معاملات کو حل کرتی ہیں۔

گورنر صاحب سے باتوں کے دوران ہماری تواضع چھوٹے چھوٹے گلاسیوں میں بغیر دودھ والی چائے سے کی گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے گورنر صاحب سے رخصت لی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ہمیں خدا حافظ کہنے کے لیے دروازے تک آئے اور ہمیں گرمجوشی سے رخصت کیا۔

استنبول کے گورنر صاحب سے مل کر اور ان سے بات چیت کر کے مجھے ایک حقیقی عوامی اور عوام دوست حکومت کی جیتی جاگتی مثال دیکھنے کا موقع ملا۔ ایسی حکومت کا پاکستان میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل ترکی ایک حقیقی معنوں میں آزاد اور بہادر قوم کی روایات کا حامل ایسا ملک ہے، جہاں انسانی رویوں میں مساوات اور شہریوں کی عزت نفس کا معیار بہت بلند ہے، جب کہ پاکستان میں غلامی کے دور کے نوآبادیاتی نظام کی بنیاد پر بنائے گئے سیاسی، انتظامی اور عدالتی نظام ابھی تک عوام کو غلامی کی حالت میں جکڑے ہوئے ہے۔

کہنے کو تو پاکستان نے 1947ء میں آزادی حاصل کر لی تھی، لیکن مراعات یافتہ طبقوں نے ملک میں ابھی تک ایک آزاد ملک کے طور طریقوں کے نظام کو لاگو نہیں ہونے دیا، جس کا خواب علامہ اقبالؒ نے دیکھا تھا اور جس کے قیام کے لیے قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے لیے بے مثال جدوجہد کی تھی۔

بقول اقبالؒ

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام



اس میں پیری کی کرامات نہ میری کا ہے زور
سیکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام

جب لوگوں کے دلوں میں آزادی اور خودی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو وہاں عدل و انصاف کی بنیاد پر فلاحی معاشرے کا قیام ممکن ہو سکتا ہے۔

واپسی

پاکستان واپس روانگی سے دودن پہلے مجھے کراچی کے ایک دوست اوران کی اہلیہ مل گئے۔ یہ میجر (ریٹائرڈ) سنی احمد صاحب ہیں جوترکی کے تجارتی اداروں سے بڑھے پیمانے پر بزنس کرتے ہیں۔ وہ وہاں کے ایک بڑے ہوٹل سرمیلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگلے دن وہ اپنے ترک دوستوں کے ساتھ استنبول کے اردگرد کے خوبصورت جگہوں کو دیکھنے اوردن گزارنے کے لیے جارہے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی دعوت دی کہ میں بھی ساتھ چلوں۔ ان کے کہنے پر میں ان کے ہوٹل رومیلی میں منتقل ہوگیا۔ یہ استنبول کے انتہائی مہنگے ہوٹلوں میں ہے۔ دوسرے دن ہم صبح صبح ہی ہوٹل سے روانہ ہو کراستنبول کی اہم اورتاریخی یادگاروں کودیکھنے کے لیے نکل گئے۔

ہوٹل سے جانے سے پہلے میں نے اپنے دوست مشکن یزیجی کوفون کرکے بتادیا کہ اس دن میں اس سے نہیں مل سکتا تھا۔ اگلے دن مجھے استنبول سے کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا، مگر عشکن یزیجی نے اگلے دن میرے ہوٹل آنے کوکہا۔

دوسرے دن عشکن یزیجی صبح صبح ہی میرے ہوٹل پہنچ گئے۔ ہم نے وہاں کافی پی اور گپ شپ کرتے رہے۔

دوپہر کے نزدیک میں اپنا سامان لے کرہوٹل کی لابی میں آگیا تاکہ بل اداکر کے ائیرپورٹ کی طرف روانہ ہوجاؤں۔ ہوٹل کے اہلکاروں سے میں نے بل بنانے کے لیے کہااورخود میں اپنے سامان کی پیکنگ وغیرہ میں لگ گیا۔ میرا بل یزیجی نے لے لیا۔ اچانک میں نے یزیجی کواونچی اونچی آواز میں

ہوٹل کے اہلکاروں سے ترکی میں جھگڑتے ہوئے سنا۔ مجھے فکر ہوئی میں نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ معلوم ہوا کہ میرے بل کی رقم دیکھ کر یزیجی کو غصہ آ گیا تھا۔ ان دنوں ترکی کے لیرا کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں انتہائی کم تھی اس لیے میرے بل میں جو لیرے تھے ان کی تعداد اتنی زیادہ غالباً لاکھوں میں تھی کہ یزیجی کو غصہ آ گیا اور اس نے ہوٹل کی انتظامیہ کو ڈانٹنا شروع کر دیا کہ وہ بے ایمانی سے ایک پاکستانی بھائی کو لوٹنا چاہ رہے تھے اور وہ بل کی رقم کو نصف یا اس سے بھی کم کرنے پر اصرار کر رہے تھے، مگر میں نے انھیں سمجھایا کہ اس میں ہوٹل کی انتظامیہ کا کوئی قصور نہیں تھا، اس جیسے تمام بڑے ہوٹلوں کے ریٹ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ بڑی مشکل سے میں نے یزیجی کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ میرے ترک دوست کو افسوس ہو رہا تھا کہ ایک پاکستانی کو اتنے پیسے دینا پڑ رہے تھے یہ اس کے خلوص اور اخوت کا ثبوت تھا۔

ائیر پورٹ پر ترک اہلکاروں نے بہترین اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے، ہر قسم کی آسانیاں مہیا کرتے ہوئے مجھے رخصت کیا۔ اس طرح ترکی میں میرے تیسرے سیاحتی سفر کا اختتام ہوا۔

ترکی کے سفر کے دوران وہاں کے تاریخی مقامات کو دیکھنا اور وہاں کے پرخلوص اور بلند اخلاق لوگوں سے ملنا اور ان کے ناقابل یقین حد تک اعلیٰ برتاؤ کی یادیں میرے لیے ایک گراں قدر سرمایے کی حیثیت رکھتی ہیں جو بھلائی نہیں جا سکتیں۔

میری ترکی کی سیاحت، اگر پورے تناظر میں دیکھی جائے تو جزوی تھی۔ ترکی میں اس سے کہیں زیادہ ایسے مقامات ہیں جو سیاحت کے نکتہ نظر سے بے حد اہم ہیں، مگر میرے لیے ان تمام جگہوں تک پہنچنا مشکل تھا۔



فیروز شاہ گیلانی کی زیرِنظر کتاب ترکی کا صرف سفرنامہ ہی نہیں بلکہ ترکی کی قدیم، جدید تاریخ پر ایک جھلک ہے۔

''یارترکی'' ایک دلچسپ، معلوماتی اور فکرانگیز کتاب ہے۔ مختصر الفاظ میں انہوں نے تاریخ، تہذیب، ثقافت اور ترکی کے سماج کو جس طرح اس کتاب میں بیان کیا ہے، اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ عثمانی ترکی اور جدید ترکی اور اس دھرتی پر پھیلے متعدد تہذیبوں کے آثار پر ان قلم کاری عوام کو ترکی کے نئے دریچوں سے آگاہ کرے گی۔

فرخ سہیل گوئندی

اس سفرنامے میں جو بات بہت اہم ہے، وہ یہ ہے کہ سید فیروز شاہ گیلانی نے خلافت عثمانیہ کا ایک مختصر جائزہ بھی پیش کیا ہے جس سے اس عالی شان سلطنت کے عروج وزوال کی داستان خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔ وگرنہ ایک سیاح استنبول جیسے دلربا شہر میں گھومتے ہوئے بادشاہوں کے ہوش رُبا محلات دیکھتے ہوئے، یہ ضرور سوچتا ہے کہ ایسی سلطنت کا زوال کیوں کر ممکن ہوا؟ یہی نہیں بلکہ اس سفرنامے میں، عرب اور ترک مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر، تاجِ برطانیہ نے جو بھیانک کھیل 9 مئی 1916ء کو کھیلا تھا، اس کو بھی بڑی سچائی اور مشاقی سے بیان کیا گیا ہے۔ فیروز شاہ گیلانی نے اتاترک مصطفی کمال پاشا کے بارے میں بڑی دردمندی سے لکھا ہے جس نے ترکیہ کے ''مردِ بیمار'' کے تن مردہ میں نئی روح پھونکی اور مسلم امہ کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ یہ سفرنامہ پڑھنے کے بعد، سیاحت کے رسیا لوگوں کو سلجوق یونیورسٹی، گوریمے، انطالیہ، ازمیر اور افسس دیکھنے کی تمنا بے چین کردے گی اور پھر وہ کون سا مسلمان ہوگا جو حضرت مریم کا گھر نہ دیکھنا چاہے گا۔ محترم فیروز شاہ گیلانی کی تحریر رواں دواں، سادہ اور دل موہ لینے والی ہے۔ ان کا فطری خلوص اور رومانی رغبت اس سفرنامے کے ایک ایک لفظ میں بول رہے ہیں۔ اختصار اس سفرنامے کی اضافی خوبی ہے، غیر ضروری واقعات، غیر اہم کردار جا بجا لا کر سفرنامے کو بوجھل نہیں کیا گیا۔ مجمل بھی اور مکمل بھی! میری رائے میں ''یارترکی'' ایک رہنما سفرنامہ ہے جو نہ صرف دو برادر ملکوں کے مذہبی، ثقافتی اور سماجی حالات کا عکاس ہے بلکہ ہر وہ پاکستانی جس کے دل میں ترکی دیکھنے کا سودا سمایا ہے، وہ اس سفرنامے کو گائیڈ کے طور پر اپنے سامان کے ساتھ رکھ سکتا ہے۔ میں سید فیروز شاہ گیلانی کو مبارکباد دیتی ہوں کہ ''یارترکی'' اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔

بشریٰ رحمٰن

